غیر مسلم پڑوسیوں کے حقوق

مقاصد شریعت کی روشنی میں

مولانا عبدالمتین ندوی

استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا)

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب : غیر مسلم پڑوسیوں کے حقوق
(مقاصد شریعت کی روشنی میں)
مؤلف : مولانا عبدالمتین ندوی
صفحات : ۸۹
سن طباعت : اکتوبر ۲۰۲۱ء

ناشر

اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا)

161-الیف، جوگابائی، پوسٹ باکس نمبر:9746
جامعہ نگر، نئی دہلی-110025
ای میل:fiqhacademyindia@gmail.com
فون:011 - 26981779,26987492

بسم الله الرحمن الرحيم

فہرست

۱-	پیش لفظ	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی	۷
۲-	غیر مسلم پڑوسیوں کے حقوق		۱۱
۳-	پڑوس کی نوعیت		۱۴
۴-	مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان سماجی تعلقات کی نوعیت		۱۵
۵-	معاہد قوم کے ساتھ اسلام کا رویہ		۲۷
۶-	اسلام کا دیگر مذاہب کے ساتھ رویہ		۳۴
۷-	غیر مسلم پڑوسیوں کے ساتھ خود رسول اللہ ﷺ، صحابہ کرام اور اسلاف کا معاملہ		۴۱
۸-	صحابہ کرامؓ کا معمول		۴۶
۹-	خلاصہ کلام		۴۷
۱۰-	سلام میں پہل سے ممانعت کی وجہ		۶۱
۱۱-	غیر مسلم کو سلام میں پہل کرنے کی وجوہات		۶۲
۱۲-	آخری بات		۶۵
۱۳-	تکثیری معاشرہ کے لئے قرآنی ہدایات	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۶۸

☆☆☆

پیش لفظ

رسول اللہ ﷺ نے جس طرح ہمیں مسلم معاشرہ میں زندگی گزارنے کی تعلیم دی ہے، اس کا سلیقہ دیا ہے، اس کا طریقہ اور منہج بتایا ہے، اسی طرح اگر کوئی مسلمان ملے جلے معاشرہ میں ہو، کثیر مذہبی سماج میں ہو، جس میں کئی مذاہب، کئی عقائد کے ماننے والے لوگ ہوں تو وہاں وہ کس طرح زندگی گزارے؟ وہاں لوگوں کے ساتھ اس کا کیا رویہ ہو؟ وہاں وہ کس طرح اپنے دین پر عمل کرے؟ اور اپنے وجود اور دینی وجود کو باقی رکھے۔ اس کے لئے حضور ﷺ نے ہمیں تعلیم دی ہے اور قرآن مجید کی سورہ کافرون تو اسی پس منظر میں نازل ہوئی ہے، جب اہل مکہ نے آپ ﷺ سے گزارش کی کہ ہم لوگ ایک ہی قبیلہ کے ہیں، ایک ہی خون ہماری رگوں میں دوڑ رہا ہے اور ہم میں مذہب کی بنا پر اختلاف ہے تو ایسا کیوں نہ ہو کہ ہم سب لوگ مل کر آپ کے خدا کی بھی عبادت کریں، اور آپ بھی ہمارے دیوی اور دیوتاؤں کی عبادت کر لیں، ایک دن یہ ہو اور ایک دن وہ ہو؛ تاکہ دونوں مذہب کا لحاظ ہو جائے، تو اللہ تعالی نے سورہ کافرون نازل فرمائی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جیسے روشنی اور تاریکی اکٹھا نہیں ہوسکتی اور جیسے رات اور دن جمع نہیں ہوسکتا اسی طرح توحید اور شرک کا اشتراک ممکن نہیں، لیکن ہاں ایک ملے جلے معاشرہ میں زندگی گزارنے کا ایک اور معقول اور مناسب طریقہ ہوسکتا ہے اور وہ ہے: ''**لكم دينكم ولي دين**'' کہ آپ اپنے مذہب پر رہیں جب تک آپ کو اسلام کی حقانیت سمجھ میں نہ آجائے اور ہمیں ہمارے دین پر عمل کرنے کی اجازت دے دیں، نہ ہم میں سے کوئی اپنے دین کو چھوڑنے پر مجبور کیا جائے اور نہ ہم ایک دوسرے کے مذہب کو چھڑانے کی کوشش کریں تو باوجود یکہ اسلام کی نظر میں دین ابراہیمی وہ حق ہے اور شرک کی جتنی بھی صورتیں ہیں وہ باطل ہیں؛ لیکن اس دنیا میں امن وامان اور سلامتی کو

باقی رکھنے کے لئے اللہ تعالی نے یہ صورت نکالی کہ اگر ایک ہی سماج میں مختلف مذاہب کے ماننے والے لوگ ہوں جن کی تعلیمات الگ الگ ہیں تو وہ اہم مقاصد کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ جمع ہوجائیں، یہی اصل میں غیر مسلم پڑوسیوں کے ساتھ تعلق کی بنیاد ہے۔

دوسری بات اللہ تعالی نے یہ فرمائی کہ جہاں مختلف مذاہب کے ماننے والے لوگ ہوں ان میں قدر مشترک تلاش کرنا چاہئے، ظاہر ہے کہ ہم نماز، روزے، حج اور زکوۃ کی دعوت دیں گے تو وہ مسلمانوں کے لئے ہوگی، برادران وطن کے لئے نہیں ہوگی تو وہ امور جو تمام ادیان ومذاہب کے درمیان مشترک ہیں ان پر ہم متفق ہیں۔اسی لئے مدنی زندگی میں رسول اللہ ﷺ سے فرمایا گیا کہ آپ غیر مسلم بھائیوں بالخصوص اہل کتاب کو دعوت دیں کہ ''**یاأهل الكتاب تعالوا إلى كلمة سواء بيننا وبينكم**.....'' اگر ہم اور تم ایک دین پر متفق نہیں ہوسکتے تو شکل یہ ہے کہ وہ باتیں جو مختلف ادیان میں قدر مشترک ہیں ہم ان پر جمع ہوجائیں، جیسے ہم اس ملک ہندستان میں رہتے ہیں، یہاں جو ہمارے برادران وطن ہیں تو ان کی بہت سی باتیں مذہب اسلام کی تعلیمات کی طرح ہیں، جیسے ماں باپ کی خدمت، ان کی عظمت، عورتوں کا احترام، بوڑھوں کا احترام، چھوٹوں کے ساتھ شفقت، ایمانداری یہاں تک کہ سود کی ممانعت، جھوٹ و دھوکہ کی ممانعت وغیرہ وغیرہ بیشتر اخلاقی تعلیمات جو ہیں وہ مشترک ہیں، تو ہم یہاں ان تعلیمات کو عنوان بنا کر آگے بڑھیں اور جو برادران وطن ہیں ان کو اپنے ساتھ لے کر چلیں، اور حضور ﷺ نے اپنی حیات طیبہ میں بھی اس کا لحاظ فرمایا، تو اس سے معلوم ہوا کہ جو مسائل ہمارے درمیان مشترک ہیں تو ان مسائل میں ہمیں شریعت کے مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے برادران وطن کے ساتھ اتحاد پیدا کرنا چاہئے۔

ہندستان میں جو اکابر علماء تھے انہوں نے اسی پر عمل کیا، جب ملک آزاد نہیں ہوا تھا تو غیر مسلم بھائیوں کے ساتھ مل کر اس ملک کو آزاد کرانے کی کوشش کی، اور یہ ملک آزاد ہوا تب بھی

یہ کوشش کی گئی کہ جو سیکولر قوتیں ہیں برادران وطن کی ان کو ساتھ لے کر چلا جائے، یہی راہ زندگی ہے ہمارے لئے؛ لیکن افسوس کہ اس حقیقت کو ہم لوگوں نے اچھی طرح سمجھا نہیں، اسلامی شریعت ہمیشہ لوگوں کو اس سلسلہ میں تعلیم دیتی رہتی ہے اور کوشش کرتی ہے کہ ہماری نئی نسل اس بات سے روشناس ہو کہ غیر مسلم پڑوسیوں کے ساتھ ہمارا تعلق کس طرح ہونا چاہئے۔

خالد سیف اللہ رحمانی

(جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی، انڈیا)

غیر مسلم پڑوسیوں کے حقوق
مقاصد شریعت کی روشنی میں

انسانی تعلقات اور ان کے حقوق کی ادائیگی کا مسئلہ بڑا اہم اور نازک ہے، بالخصوص اس کی حساسیت اور نزاکت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب آپس میں بسنے والا انسان مختلف افکار ونظریات، اور عقائد و مذاہب کا ماننے والا ہو، جن کا طرز حیات، تہذیب و معاشرت ایک دوسرے سے مختلف ہو، ان کے درمیان عدل و انصاف قائم کرنا، الفت ومحبت، رافت ورحمت کے ساتھ جینا، آپس میں ظلم وزیادتی سے اجتناب کرنا صالح اور مہذب سماج کا اولین فریضہ ہوتا ہے، اس میں ادنی سی کوتاہی اچھے بھلے سماج کو قتل وغارتگری اور ظلم وزیادتی اور حق تلفی وانصافی کی آماجگاہ بنادیتی ہے، اسی وجہ سے معاشرہ کے اندر امن وسکون اتحاد واتفاق قائم کرنے کے لئے دو ہی چیزیں مؤثر ہوسکتی ہیں، ایک ہے اخلاق دوسرا ہے قانون، ان دونوں کی بالادستی کسی بھی معاشرہ کو امن وامان، اور عدل وانصاف کا گہوارہ بنادیتی ہے، اور اس سے تغافل سماج کو جنگل راج میں تبدیل کردیتا ہے، حقوق پامال کئے جاتے ہیں، مظلوم طاقتور کے ظلم وستم کا نشانہ بنتا ہے، عدل و انصاف کا گلا گھونٹا جاتا ہے، اور جنت نشاں کرہ ارض شر وفساد، ظلم و جبر اور سفاکیت وبربریت کا میدان بن جاتا ہے۔

دین اسلام جو سراپا صلح وآشتی، اخوت ومحبت، شفقت ورحمت ہے، جس نے انسان تو انسان جانور اور نباتات تک کے حقوق بیان کئے ہیں، اس پر علاحدگی پسندی اور دوسرے مذاہب کے ماننے والوں، اور اس سے مختلف نظریات کے حامل فرد سے قطع تعلق رکھنے کا الزام اسلام کی بنیادی تعلیمات کے بالکل منافی ہے، جو اسلام بلا وجہ ایک جان کے قتل کو پوری نوع انسانیت کا

قتل تصور کرتا ہو جیسا کہ ارشاد باری ہے: ''**من قتل نفسا بغير نفس أو فساد فی الأرض فكأنما قتل الناس جميعا**''، کہ اگر کسی نے ایسے انسان کو قتل کر دیا جس نے نہ کسی انسان کو قتل کیا ہو اور نہ زمین میں فساد پھیلایا ہو تو گویا اس نے پوری انسانیت کا قتل کر دیا، جو اسلام یہ کہتا ہو کہ تم میں سے کوئی شخص مومن ہی نہیں ہوسکتا یہاں تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے وہی پسند نہ کرتا ہو جو اپنے لئے پسند کرتا ہو، جیسا کہ امام بخاری و مسلم حضرت انس بن مالکؓ سے روایت کرتے ہیں:''**عن النبی ﷺ لایؤمن أحدكم حتی يحب لأخيه ما يحب لنفسه**''، جو اسلام اس بات کا دعویدار ہو کہ وہ شخص مومن نہیں ہوسکتا جس کے شر سے اس کا پڑوسی محفوظ نہ ہو، جیسا کہ ارشاد نبوی ﷺ ہے:''**عن أبی هريرةؓ أن النبی ﷺ قال: والله لا يؤمن والله لا يؤمن والله لا يؤمن، قيل: من يا رسول الله ﷺ؟قال:الذی لا يأمن جاره بوائقه، متفق عليه**'' کہ خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہوسکتا، خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہوسکتا، خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہوسکتا۔عرض کیا گیا: کون اے اللہ کے رسول؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جس کے شر سے اس کا پڑوسی محفوظ نہ ہو، دوسری روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:''**من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فلا يؤذجاره**''(جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ اپنے پڑوسی کو اذیت نہ پہنچائے)۔

جو دین جانور کو پانی پلانے پر جنت میں داخلہ کی خوشخبری سناتا ہو، جیسا کہ ارشاد نبوی ﷺ ہے:''**فی كل كبد رطبة أجر**''(بخاری و مسلم)(ہر ذی جان میں اجر ہے) یعنی کسی بھی جاندار کو کھانا کھلانے اور پانی پلانے میں اجر ہے۔ جو دین درختوں کے لگانے کی تاکید اور پھلدار درختوں کے کاٹنے سے منع کرتا ہو، جیسا کہ ارشاد نبوی ہے:''**أوصانا رسول الله ﷺ فی الحروب فقال: لا تقطعوا شجرة، وألا تقتلوا إمرأة، ولا صبيا، ولا وليدا ولا شيخا كبيرا ولامر يضا**''(نہ کسی درخت کو کاٹو، اور یہ کہ نہ کسی عورت، نہ کسی بچے، نہ کسی لڑکے، نہ کسی بڑے بوڑھے اور نہ کسی مریض کو قتل کرو)۔

ان واضح ارشادات و پیغامات کے بعد بھی اسلام پر دوسرے مذاہب کے ماننے والوں سے قطع تعلق اور بیزاری اور گرد و پیش کے ماحول سے بے رغبتی کا الزام لگانا بالخصوص پڑوسیوں کے ساتھ عدم رواداری کا الزام عائد کرنا اس کے سوا کیا کہہ سکتے ہیں کہ یا تو اغیار کو اسلام کی تعلیمات سے آگہی نہیں ہے یا پھر محض اسلام دشمنی میں اسلام کے روشن جبیں پر داغ و دھبہ لگانے، اور اسلام کی برتری و سربلندی کو قبول نہ کرنے، اور کسی بھی قیمت پر اسے گوارہ نہ کرنے بلکہ اس کو مسخ کرنے، اور اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ عدوات ونفرت کا جذبہ کارفرما ہے، حالانکہ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ دنیا دامن اسلام میں پناہ لیتی، اس کی روشن تعلیمات سے مستفید ہوتی، اس کی عطر بیز خوشبو سے مشام جام کو معطر کرتی، اور پورا عالم مانند ایک کنبہ ہوتا، اور پوری دنیا امن و سکون، صلح و آشتی کا گہوارہ ہوتی، اور شر و فساد کا کہیں نام نہ ہوتا، لیکن برا ہو شیطان مردود کا جس نے آدم کے مسجود خلائق ہوتے ہی بزعم خود کہ میں آگ سے پیدا ہوا اور آدم کو تو نے مٹی سے پیدا کیا، میں کس طرح اس کے سامنے سجدہ ریز ہوسکتا ہوں، بس کیا تھا مطرود بارگاہ ایزدی ہوا، لیکن اسی وقت اس نے ٹھان لیا اور خلاق ازل سے یہ مہلت بھی مانگ لی کہ مسجود ملائکہ اور انکی اولاد کو کسی صورت جنت میں داخل نہیں ہونے دوں گا، اور ہوائے نفس میں ایسا مبتلا کروں گا کہ وہ تیری سجائی ہوئی جنت کا منہ بھی نہ دیکھ پائے گی، سوائے تیرے مخلص اور نیک بندوں کے، اور آج وہی ہو رہا ہے، ارشاد باری ہے: ''**وقال فبما أغويتنى لاقعدن لهم صراطک المستقيم، ثم لآتينهم من بين أيديهم ومن خلفهم وعن أيمانهم، وعن شمائلهم، ولا تجد اكثرهم شاكرين**''(اعراف:۱۶-۱۷)۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ فقہاء کے یہاں غیر مسلموں کے سلسلے میں جو تفصیلات ملتی ہیں مثلاً ملکی نظام اور اس کے دفاع اور اس کی حفاظت کے لئے ان کی خدمات کی چنداں ضرورت نہیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اول یہ تو ملکی نظام اور اسلامی ریاست کے دفاع سے متعلق معاملہ ہے جو ہمارے موضوع سے خارج ہے، دوسرے یہ کہ اسلامی فقہ کی تدوین وترتیب ایسے ماحول

میں ہوئی جب پوری ریاست سے مسلمان اور مکمل طور پر مسلمان اپنے نظام مملکت چلانے اور اس کے تحفظ کے اہل تھے، اس میں معمولی غیر مسلم اقلیت کو اسلامی ریاست میں دخیل بنانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی، آج جب کہ مسلمانوں کی آدھی آبادی ان ملکوں میں بستی ہے جہاں مسلمانوں کو قوت نافذہ حاصل نہیں ہے، مسلمان وغیر مسلم ایک ساتھ رہتے ہیں، دونوں ایک دوسرے کے پڑوسی ہیں، شادی بیاہ خوشی وغم میں دونوں ایک دوسرے کے شریک رہتے ہیں، ایسی صورت میں شریعت اسلامیہ مسلمانوں کو کیا پیغام دیتی ہے، کس حد تک ان کے حقوق کی پاسداری کی جائے گی، اور کس حد تک نہیں، ذیل میں انہیں امور سے متعلق ہم گفتگو کریں گے۔

پڑوس کی نوعیت:

اسلام چونکہ سراپا سلامتی کا نام ہے، اس کی نظر میں پوری نوع انسانیت ایک ماں حواء اور باپ حضرت آدم علیہما السلام کی اولاد ہے، اس کے یہاں حسن سلوک اور رواداری برتنے میں مسلمان اور غیر مسلم کی کوئی قید نہیں ہے، اور خالق کائنات نے بغیر کسی تفریق کے تکریم وتفضیل سے نوازا ہے، ارشاد باری ہے: "**ولقد کرمنا بنی آدم وحملناھم فی البروالبحر ورزقناھم من الطیبات وفضلناھم علی کثیر ممن خلقنا تفضیلا** "(الاسراء:۷)(یہ تو ہماری عنایت ہے کہ ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور انہیں خشکی وتری میں سواریاں عطا کیں، اور ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فوقیت بخشی)۔

یہ بات اسلام کے میزان عدل سے پرے تھی کہ ایک انسان خواہ اس کا مذہب کچھ بھی ہو، وہ کسی عقیدہ کا ماننے والا ہو، اس کی فکر اس کی فکر سے ہم آہنگ نہ ہو، لیکن اگر وہ مسلمان کے پڑوس میں رہتا ہے، تو اس کے ساتھ رہن سہن، کھانا پینا، کس حد تک انکے ساتھ تعلقات بنائے اور کس حد تک نہیں، ان کے حقوق وآداب ذکر نہ کئے جائیں؟ یہ ممکن ہی نہیں تھا، پھر اگر کسی مسلمان کا غیر مسلم پڑوسی کسی غیر مسلم ملک میں رہتا ہے تو ان کے ساتھ تعلقات کی نوعیت کیا ہو؟ یہ سب ہم ذیل کے سطور میں علی الترتیب ان شاء اللہ ذکر کرنے کی کوشش کریں گے۔

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان سماجی تعلقات کی نوعیت:

اسلام ایک مکمل دستور حیات ہے، اس کی ایک مستقل تہذیب ہے اور اس کا اپنا عقیدہ ہے، جو خالق ارض وسماء کی طرف سے عطا کردہ ہے، اس میں کسی طرح کی آمیزش یا اس میں دوسری تہذیبوں کا کسی طرح کا اختلاط اسلام کے لئے نا قابل برداشت ہے؟ کیونکہ وہ کامل ہے مرضی مولا ہے، اس میں کسی طرح کی کمی وزیادتی خالق کائنات کو چیلنج کرنا ہے، قرآن کہتا ہے: **"اليوم أكملت لكم دينكم، وأتممت عليكم نعمتي، ورضيت لكم الاسلام دينا"** (المائدہ:۳) (آج کے دن میں نے تمہارا دین تمہارے لئے مکمل کر دیا، اور تمہارے لئے میں نے اپنی نعمت مکمل کر دی، اور تمہارے لئے بحیثیت دین اسلام سے راضی ہو گیا)۔

دوسری جگہ ارشاد ہے: **"ومن يتبغ غير الاسلام دينا فلن يقبل منه، وهو في الآخرة من الخاسرين"** (آل عمران:۸۵) (اور جو شخص اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کو طلب کرے گا تو وہ دین خدا کے نزدیک مقبول نہ ہوگا اور وہ شخص آخرت میں تباہ کاروں میں سے ہوگا)۔

امام نسائی نے ایک روایت نقل کی ہے: **"عن النبي ﷺ أنه رأى في يدعمر بن الخطابؓ ورقة من التوارة، فقال: أمتهوكون يا ابن الخطاب، لقد جئتكم بها بيضاء نقية، فلوكان موسى حيا، واتبعتموه وتركتمونى ضللتم(باب وجوب الاستغناء بمتابعة الكتاب عن كل ماسواء"** (آپ ﷺ نے حضرت عمرؓ کے ہاتھ میں توراۃ کا ایک ورق دیکھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا تم حیران ہوائے ابن خطاب، میں جو شریعت لے کر آیا ہوں وہ بالکل صاف ستھری ہے، اگر موسیٰؑ زندہ ہوتے اور تم لوگ ان کی اتباع کرتے تو گمراہ ہوتے)۔

مسند احمد کی ایک روایت میں ہے: **"ولوكان موسى عليه السلام حيا ما وسعه إلا اتباعى"** (اور اگر موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو ان کے لئے میری اتباع کے سوا کوئی گنجائش نہ ہوتی)۔

اسی طرح ایک دوسری روایت ہے: جو عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے مروی ہے کہ میرے اوپر رسول اللہ ﷺ نے دو زعفرانی رنگ کے کپڑے دیکھے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''إن **هذه ثياب الكفار فلا تلبسهما**'' (رواہ مسلم، باب النہی عن لبس الرجل الثوب المعصفر) (یہ کفار کا لباس ہے اس کو مت پہنو)۔

تیسری روایت حضرت رکانہؓ حضور ﷺ سے نقل کرتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''**فرق ما بيننا وبين المشركين العمائم على القلانس**'' (رواہ الترمذی، کتاب اللباس، حدیث غریب اسنادہ لیس بقائم) (ہمارے اور مشرکین کے عماموں میں فرق یہ ہے کہ ہمارا عمامہ ٹوپیوں پر ہوتا ہے ان کا نہیں)۔

حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں: ''**إن اليهود والنصارى لا يصبغون فخالفوهم**'' (متفق علیہ) (یہود و نصاری بالوں میں خضاب نہیں لگاتے تم ان کی مخالفت کرو)۔

اسی طرح دوسری روایت حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''**غيروا الشيب ولا تشبهوا باليهود**'' (رواہ البخاری ومسلم) (سفیدی کو بدلو اور یہودیوں کی نقل مت اتارو)۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے عاشورہ کا روزہ رکھا اور لوگوں کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا تو لوگوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! یہود و نصاری اس دن کا بڑا احترام کرتے ہیں، تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''**لئن بقيت إلى قابل لأصومن التاسع**'' (اگر میں آئندہ سال زندہ رہا تو نویں تاریخ کو بھی ضرور بالضرور روزہ رکھوں گا)۔

حضرت ام سلمہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہفتہ اور اتوار کو بطور خاص روزہ رکھا کرتے اور فرماتے کہ: ''**انها يوما عيد للمشركين فأحب أن أخالفهم**'' (رواہ ابوداؤد والنسائی وصحیح ابن حبان، فتح الباری ۴/ ۳۰۵) (یہ دونوں دن مشرکوں کی عید کے دن ہیں، لہذا میں چاہتا

ہوں کہ ان کی مخالفت کروں)۔

حضرت شداد بن اوسؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''**خالفوا الیھود فإنھم لا یصلون فی نعالھم ولاخفافھم**'' (رواہ ابوداؤد) (یہود کی مخالفت کرو وہ اپنے جوتوں اور خف میں نماز نہیں پڑھتے)۔

حضرت ابوریحانہ روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے کئی باتوں سے منع فرمایا، ان میں سے ایک بات یہ ہے کہ آدمی اپنے کپڑے کے نیچے ریشم لگائے، اس لئے کہ یہ عجمیوں کا طرز ہے، یا یہ کہ آدمی اپنے مونڈھے پر ریشم لگائے، اس لئے کہ یہ بھی عجمیوں کا طریقہ ہے (رواہ ابوداؤد والنسائی، کتاب اللباس)۔

حضرت جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''**إن کدتم لتفعلوا فعل الفارس یقومون علی ملوکھم وھم قعود فلاتفعلوا**'' (اعلاء السنن ۱۷/ ۴۲۳) (قریب ہے کہ تم لوگ فارس وروم والوں کی طرح کرنے لگو، وہ لوگ اپنے بادشاہوں کے لئے کھڑے ہوتے ہیں اور بادشاہ بیٹھے رہتے ہیں تو تم لوگ ایسا مت کرو)۔

حضور اکرم ﷺ کو اپنی امت کے تہذیبی اختلاط اور میل جول کا شدید اندیشہ تھا، چنانچہ ایک موقعہ پر ارشاد فرمایا: ''**تتبعن سنن من قبلکم شبرا بشبر وذراعا بذراع حتی لو دخلوا جحر ضب تبعتموھم، قیل: یا رسول اللہ الیھود والنصاری؟ قال: فمن**'' (تم اپنے سے پہلے والوں کی پوری طرح پیروی کرو گے، بالشت در بالشت، ہاتھ در ہاتھ یہاں تک کہ اگر وہ کسی گوہ کی بل میں داخل ہوں گے تو ان کی دیکھا دیکھی تم بھی اس بل میں گھس پڑو گے، لوگوں نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! پہلے والوں سے یہود ونصاری مراد ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: پھر اور کون ہے (متفق علیہ)۔

مذکورہ بالا روایات سے جو بات روز روشن کی طرح عیاں ہے وہ یہ کہ مسلمان دنیا کے جس گوشہ میں بھی آباد ہوں اپنی تہذیب وثقافت اور اپنے عقیدہ وایمان کے ساتھ جئیں، اپنے

اندر کسی دوسری تہذیب وعقیدہ کو در آنے نہ دیں، اور اپنے ایمان وعقیدہ اور اسلامی تشخصات کے ساتھ کسی طرح کا کوئی سمجھوتہ نہ کریں، چاہے اس کے لئے اس کو کتنی بڑی سے بڑی قیمت چکانی پڑے)۔

مولانا اختر امام عادل قاسمی لکھتے ہیں: اس طرح کی روایات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام چاہتا ہے کہ مسلمان روئے زمین کے جس حصہ پر بھی آباد ہوں، اپنی تہذیب وثقافت، اسلامی اقدار وروایات اور اپنی پوری شناخت کے ساتھ آباد ہوں، اور غالباً یہی وجہ تھی کہ یہود ونصاری سے جزیرۃ العرب کے تخلیہ کا عمل خود عہد نبوی ﷺ میں شروع کر دیا گیا تھا، جس کی تکمیل حضرت عمرؓ کے ذریعہ عمل میں آئی، حضور ﷺ نے یہود کے سامنے جو خطاب فرمایا اس سے اس کی طرف صاف اشارہ ملتا ہے، آپ ﷺ نے ان کو مخاطب کر کے فرمایا:

"**یامعشر یھود! أسلموا تسلموا، اعلموا أن الأرض للہ ولرسولہ وإنی أرید أن أجلیکم من ھذہ الأرض**" (متفق علیہ، مسلم، کتاب الجہاد والسیر، باب إجلاء الیہود من الحجاز، حدیث:۴۵۹۱، وبخاری، کتاب الإکراہ، باب بیع المکرہ، حدیث:۶۵۴۵) (اے جماعت یہود! مسلمان ہو جاؤ، سلامتی پاؤ گے، جان لو کہ زمین اللہ اور اس کے رسول کی ہے، اور میں تم کو اس سرزمین سے جلاوطن کرنا چاہتا ہوں)۔

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: "**لئن عشت إن شاء اللہ لأخرجن الیھود والنصاری من جزیرۃ العرب لاأدع فیھا إلا مسلما**" (رواہ مسلم، حدیث:۱۷۶۷، ابوداؤد، حدیث:۳۰۳۰، الترمذی حدیث:۱۶۰۶) (آپ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر زندہ رہا تو ان شاء اللہ یہود ونصاری کو جزیرۃ العرب سے نکال دوں گا اور اس میں سوائے مسلمان کے کسی کو اس میں نہیں چھوڑوں گا)۔

آگے فرماتے ہیں: اگرچہ کہ یہ حکم جزیرۃ العرب کے لئے خاص ہے، اور ساری زمین کو جزیرۃ العرب کا مقام نہیں مل سکتا، لیکن اس سے جو رجحان سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ حضور

ﷺ کی منشاء یہ تھی کہ مسلمان روئے زمین پر ایک مکمل زندگی گزاریں، جہاں غیر اسلامی قوم یا تہذیب کے اثرات نہ ہوں (غیر مسلم ملکوں میں آباد مسلمانوں کے مسائل/ص ۹۴ تا ۹۵)۔

اس باب میں دو حدیثیں اور ذکر کر دینا فائدہ از خالی نہیں ہوگا، اور اس سے آپ ﷺ کا منشاء اور خواہش مزید واضح ہوتی ہے، حضرت جندب بن جنادہؓ نبی اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''**لاتساكنوا المشركين ولا تجامعوهم فمن ساكنهم أوجامعهم فهو مثلهم**'' (ترمذی، باب ماجاء فی کراہیۃ المقام بین أظہر المشرکین، ابوداؤد و والنسائی) (مشرکوں کے درمیان نہ رہو اور نہ ان کے ساتھ ایک جگہ جمع ہو، جو ان کے درمیان رہے یا ان کے ساتھ رہے یا ان کے ساتھ اکٹھا ہو وہ انہیں کے مثل ہے)۔

دوسری روایت جریر بن عبداللہ البجلیؓ کی ہے جس کو امام ترمذی و ابوداؤد نے نقل کیا ہے: ''**أن رسول الله ﷺ بعث سرية إلى خثعم، فاعتصم ناس بالسجود فأسرع فيهم القتل فبلغ ذلک النبی ﷺ فأمرلهم بنصف العقل الدية وقال أنا برىء من كل مسلم يقيم بين أظهر المشركين، قالوا: يا رسول الله!لما؟قال:لاتترای ناراهما**'' (ابوداؤد، باب النہی عن قتل من اعتصم بالسجود) (حضور ﷺ نے ایک سریہ قبیلہ خثعم کی طرف روانہ کیا تو کچھ لوگ اپنے ایمان کے اظہار اور قتل سے بچنے کے لئے سجدہ میں چلے گئے، لیکن مسلم فوجیوں نے اس کی رعایت نہ کی اور ان کو قتل کر دیا، اس کی اطلاع نبی اکرم ﷺ کو ملی تو آپ ﷺ نے ان کی نصف دیت ادا کرنے کا حکم فرمایا، اور فرمایا: میں ہر ایسے مسلمان سے بری ہوں جو مشرکین کے درمیان قیام پذیر ہوں، لوگوں نے عرض کیا: کیوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اتنی دور رہیں کہ دونوں ایک دوسرے کی آگ نہ دیکھ سکیں)۔

مذکورہ بالا روایت سے کیا مراد ہے؟ آیا یہ روایات دارالحرب میں رہنے والے مسلمانوں سے متعلق ہیں یا مخلوط آبادی میں رہنے سے متعلق ہے، علماء کی اس سلسلے میں مختلف آراء ہیں:

علامہ طیبیؒ لکھتے ہیں کہ مسلمان کے لئے کافروں کے ساتھ سکونت اختیار کرنا درست نہیں، اور حضور ﷺ نے ایسے ہی مسلمانوں سے اپنی براءت کا اظہار کیا ہے، علماء نے اس کی کئی توجیہات کی ہیں: مثلا: ۱- ابوعبید کا کہنا ہے کہ اس کا تعلق سفر سے ہے کہ اگر مسلمان کو دوران سفر قیام کی نوبت آئے تو مسلمانوں کی بستی میں قیام کرے، غیر مسلموں کی بستی میں نہیں، اس لئے کہ ان سے اس قسم کا معاہدہ نہیں ہے، وہاں جان کو خطرہ ہوسکتا ہے۔

۲- ابوالہیثم کہتے ہیں کہ یہ ممانعت اس لئے ہے کہ غیر مسلموں کے تہذیبی اور فکری اثرات مسلمانوں کے اندر منتقل نہ ہوں، نار کا اطلاق سیرت واخلاق اور عادات واطوار پر بھی ہوتا ہے۔

۳- تورشتی نے اس کو فرقہ وارانہ کشیدگی کا سبب بتایا ہے، غرض اس کی کئی توجیہات کی گئی ہیں، البتہ جو لوگ اس کے لئے مجبور ہیں مثلاً مسلم قیدی وغیرہ تو ان کے لئے کوئی ممانعت نہیں ہے (شرح الطیبی، کتاب القصاص، باب قتل اہل الردۃ ۷/ ۱۱۰، المرقات لعلی القاری ۴/ ۵۵)۔

ان روایات کے تعلق سے علامہ ابن حزم، اور علامہ ابوبکر الجصاص کے درمیان بڑا اختلاف ہے، ایک طرف ابن حزم اپنی کتاب ''المحلی'' کے اندر لکھتے ہیں کہ غیر مسلموں کے بیچ بغیر عذر کے رہنے والے مسلمانوں کا ایمان ہی معتبر نہیں ہوگا؛ کیونکہ آپ ﷺ نے ان سے اپنی براءت کا اظہار فرمایا (المحلی ۱۱/ ۲۰۰)۔

جبکہ جصاص فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے براءت مومن کے جان و مال سے فرمایا ہے، ایمان سے نہیں، اس لئے آپ ﷺ نے ان کے لئے نصف دیت دینے، اور مسلمان کے لقب سے ملقب کیا ہے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ غیر مسلموں کے بیچ قیام سے دین وایمان کو خطرہ لاحق نہیں ہوتا، البتہ جان و مال کو خطرہ لاحق ہوسکتا ہے (احکام القران: ابوبکر جصاص ۲/ ۳۴۲)۔

اور ہم نے جو روایات اور اقوال علماء ذکر کئے ہیں ان سے جو بات سامنے آتی ہے کہ مسلمانوں کا غیر مسلموں سے تعلقات کا دائرہ کیا ہو؟ کس حد تک مسلم معاشرہ غیروں سے قریب

ہوسکتا ہے اور کس حد تک نہیں، ذیل میں ہم کچھ قرآنی آیات پیش کرنے جارہے ہیں جس کے بارے میں اغیار بڑا شور مچاتے ہیں کہ اسلام مسلمانوں کو دوسری قوموں سے بالکل الگ تھلگ رہنے اور دوسری قوموں پر جبر وظلم کرنے، اور زبردستی ان کو اپنے دین منوانے پر مجبور کرتا ہے، ہم ان آیات کو بھی ذکر کررہے ہیں پھر اس کا پس منظر بھی کہ کن حالات میں یہ آیتیں اتریں اور کیوں کر مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے:

۱-''**لایتخذ المؤمنون الکافرین أولیاء من دون المؤمنین، ومن یفعل ذلک فلیس من اللہ فی شیء إلا أن تتقوا منھم تقاۃ**'' (آل عمران:۳۰)(ایمان والے مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں، جو ایسا کرے گا اس کا اللہ سے کچھ بھی تعلق نہ ہوگا، مگر یہ کہ تم ان سے بچاؤ چاہو)۔

۲-''**یاایھا الذین آمنوا لا تتخذوا آباؤکم وإخوانکم أولیاء إن استحبوا الکفر علی الإیمان ومن یتولھم فأولئک ھم الظالمون**''(توبہ:۳)(اے ایمان والو! اپنے باپ اور بھائیوں کو اگر وہ ایمان کے برخلاف کفر سے محبت رکھیں، اپنا دوست نہ بناؤ، اور تم میں سے جو لوگ ان سے دوستی رکھیں گے تو وہی حد سے گذرنے والے ہوں گے)۔

۳-''**یا أیھا الذین آمنوا لا تتخذوا الیھود والنصاری أولیاء، بعضھم أولیاء بعض ومن یتولھم منکم فإنہ منھم، إن اللہ لا یھدی القوم الظالمین، فتری الذین فی قلوبھم مرض یسارعون فیھم یقولون نخشی أن تصیبنا دائرۃ فعسی اللہ أن یأتی بالفتح أو أمر من عندہ فیصبحوا علی ما أسروا فی أنفسھم نادمین**''(مائدہ:۸)(اے ایمان والو! یہودیوں اور نصرانیوں کو رفیق نہ بناؤ، وہ آپس میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں، اور جو کوئی تم میں سے ان سے رفاقت کرے وہ انہی میں ہے، اللہ بے انصاف لوگوں کو راہ نہیں دیتا، اب تو ان کو دیکھتا ہے جن کے دل میں بیماری ہے کہ وہ دوڑ کر ان سے جا ملتے ہیں کہتے ہیں تم کو ڈر ہے کہ ہم پر کوئی گردش نہ آجائے، تو اللہ شاید جملہ مسلمانوں کی فتح

یا (ان کی کامیابی کی) کوئی اور بات اپنے پاس سے بھیجے تو پھر وہ اپنے دل کی چھپی بات پر پچھتانے لگیں)۔

"یا أیها الذین آمنوا لا تتخذوا الذین اتخذوا دینکم هزوا ولعبا من الذین أوتوا الکتاب من قبلکم، والکفار أولیاء واتقواالله إن کنتم مؤمنین" (سورۂ مائدہ:۵)۔

(اے ایمان والو! اہل کتاب اور کفار میں سے ان کی جو تمہارے دین کو ہنسی مذاق بناتے ہیں اپنا رفیق نہ بناؤ اور خدا سے ڈرو اگر یقین رکھتے ہو)۔

۵-"یا أیها الذین آمنوا لا تتخذوا بطانة من دونکم لا یألونکم خبالا ودّوا ما عنتم قد بدت البغضاء من أفواهم، وما تخفی صدورهم أکبر، قد بیّنا لکم الآیات إن کنتم تعقلون، هأنتم أولاء تحبونهم ولا یحبونهم وتؤمنون بالکتاب کله، وإذا لقوکم قالوا آمنا، وإذا خلوا عضّوا علیکم الأنامل من الغیظ، قل موتوا بغیظکم، إن الله علیم بذات الصدور،إن تمسسکم حسنة تسؤهم، وإن تصبکم سیئة یفرحوا بها، وإن تصبروا وتتقوا لا یضرکم کیدهم شیئا إن الله بما یعملون محیط" (آل عمران:۱۱۸-۱۲۱) (اے ایمان والو! اپنے لوگوں کے سوا دوسروں کو راز دار نہ بناؤ، وہ تمہارے بگاڑ میں کوتاہی نہیں کرتے ہیں، وہ اس چیز سے خوش ہوتے ہیں جس سے تمہیں تکلیف پہنچے، ان کے منہ سے بغض وعداوت ظاہر ہے اور جو کچھ ان کے سینوں میں پوشیدہ ہے وہ اس سے بھی زیادہ ہے، ہم نے تمہیں اپنی آیات کھول کر بیان کر دی ہیں، اگر تم عقل سے کام لو، دیکھو تم ان سے محبت کرتے ہو اور وہ تم سے محبت نہیں کرتے۔ اور تم تمام آسمانی کتابوں پر بھی ایمان رکھتے ہو، جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی ایمان لے آئے، اور جب تنہائی میں ہوتے ہیں تو تمہارے خلاف غصہ سے انگلیاں چبانے لگتے ہیں، ان سے کہو کہ مرو اپنے غصہ سے، بے شک اللہ سینے کی باتوں کو جاننے والا ہے، اگر تمہیں کوئی

بھلائی پہنچے تو انہیں تکلیف ہوتی ہے اور اگر تمہیں تکلیف پہنچے تو وہ خوش ہوتے ہیں، اگر تم صبر کرو اور تقوی اختیار کرو تو ان کی کوئی چال تمہیں کچھ نقصان نہیں پہنچا ئیگی، بے شک اللہ جو کچھ یہ کر رہے ہیں اسے احاطہ میں لئے ہوئے ہے)۔

۶-"**بشر المنافقين بأن لهم عذابا أليما الذين يتخذون الكافرين أولياء من دون المؤمنين أيبتغون عندهم العزة فإن العزة لله جميعا، وقد نزل عليكم فى الكتاب أن إذا سمعتم آيات الله يُكفر بها ويُستهزأ بها فلا تقعدوا معهم حتى يخوضوا فى حديث غيره، إنكم إذا مثلهم إن الله جامع المنافقين والكافرين فى جهنم جميعا الذين يتربصون بكم، فإن كان لكم فتح من الله قالوا لم نكن معكم، وإن كان للكافرين نصيب قالوا ألم نستحوذ عليكم، ونمنعكم من المؤمنين فالله يحكم بينكم يوم القيامة، ولن يجعل الله للكافرين على المؤمنين سبيلا، إن المنافقين يخادعون الله وهوخادعهم، وإذا قاموا إلى الصلاة قاموا كسالى يراؤون الناس، ولا يذكرون الله إلا قليلا، مذبذبين بين ذلك لا إلى هؤلاء ولا إلى هؤلاء، ومن يضلل الله فلن تجد له سبيلا**"(نساء:۱۳۸-۱۴۳)۔

(منافقوں کو خوشخبری سنادو کہ ان کے لئے دردناک عذاب ہے، جو اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق بناتے ہیں، کیا وہ ان کے پاس عزت تلاش کرتے ہیں، عزت تو ساری اللہ کے ہاتھ میں ہے، اللہ تعالی تمہیں اس کتاب میں پہلے ہی یہ ہدایت دے چکا ہے کہ جب تم سنو کہ اللہ کی آیات کا انکار ہو رہا ہے، اور ان کا مذاق اڑایا جارہا ہے تو تم ان کے ساتھ نہ بیٹھو جب تک کہ وہ دوسری بات میں نہ لگ جائیں، ورنہ تمہارا شمار بھی ان ہی میں ہوگا، بے شک اللہ تعالی منافقین اور کفار کو جہنم میں ایک ساتھ جمع کرے گا، ان منافقین کا حال یہ ہے کہ وہ تمہارے بارے میں انتظار میں لگے ہوئے ہیں، اگر تمہیں اللہ کی طرف سے فتح و کامرانی حاصل ہو تو وہ کہیں گے کہ

کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے، اور اگر کافروں کو اس کا کچھ حصہ ملے تو کہیں گے کہ کیا ہم نے تمہیں گھیر نہیں لیا تھا، اور اہل ایمان سے بچایا نہیں تھا، اللہ قیامت کے روز ان کے درمیان فیصلہ کرے گا، اور اللہ ہرگز کافروں کو اہل ایمان پر غلبہ کی راہ نہیں دے گا، منافقین اللہ کو دھوکہ دے رہے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ انہیں دھوکہ میں ڈالے ہوئے ہے، جب وہ نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو سستی اور بے ادبی کے ساتھ لوگوں کو دکھانے کے لئے کھڑے ہوتے ہیں، اللہ کو بہت کم یاد کرتے ہیں، یہ حق و باطل کے درمیان تذبذب میں ہیں، نہ اس طرف ہیں اور نہ اس طرف، جسے اللہ گمراہ کردے اس کے لئے تم ہرگز کوئی راستہ نہیں پا سکتے)۔

۷-"**لاتجد قوما يؤمنون بالله واليوم الآخر يوادّون من حاد الله ورسوله، ولو كانوا آباء هم أوأبناء هم أوإخوانهم أو عشيرتهم، أولئک كتب فی قلوبهم الايمان وأيّدهم بروح منه ويدخلهم جنات تجری من تحتها الأنهار خالدين فيها، رضی الله عنهم ورضوا عنه، أولئک حزب الله، ألا إن حزب الله هم المفلحون**"(المجادلہ:۲۲)(تم یہ نہ دیکھو گے کہ جن لوگوں کا اللہ اور یوم آخرت پر ایمان ہے وہ ان لوگوں سے مودت اور تعلقات رکھتے ہیں، جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں خواہ ان کے باپ ہوں یا بیٹے یا بھائی یا ان کے خاندان والے، یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان لکھ دیا ہے، اور اپنی طرف سے ایک روح کے ذریعہ ان کی مدد کی ہے، وہ ان کو ایسی جنت میں داخل کرے گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ ان سے راضی ہوئے، یہ اللہ کے گروہ کے لوگ ہیں، یاد رکھو اللہ کے گروہ والے ہی کامیاب ہوں گے)۔

۸-"**يايها الذين آمنوا لا تتخذوا عدوی وعدوكم أولياء، تلقون إليهم بالمودة، وقد كفروا بما جاء كم من الحق، يخرجون الرسول وإياكم أن تؤمنوا بالله ربكم، إن كنتم خرجتم جهادا فی سبيلی وابتغاء مرضاتی تسرون إليهم**

بالمودة، وأنا أعلم بما أخفيتم وما أعلنتم، ومن يفعله منكم فقد ضل سواء السبيل، إن يثقفوكم يكونوا لكم أعداء ويبسطوا إليكم أيديهم وألسنتهم بالسوء، وودّوا لوتكفرون، لن تنفعكم أرحامكم ولاأولادكم يوم القيامة يفصل بينكم، والله بما تعملون بصير "(الممتحنہ ۱-۳)۔

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو میرے اور اپنے دشمنوں کو اولیاء اور دوست نہ بناؤ، تم ان سے دوستی کا تعلق قائم کرتے ہو جبکہ وہ اس حق کا انکار کر چکے ہیں جو تمہارے پاس آیا ہے، وہ اللہ کے رسول کو اور تمہیں اس بات پر نکالتے ہیں کہ تم اپنے رب اللہ پر ایمان رکھتے ہو (اس طرح تعلق قائم کرنا صحیح نہیں) اگر تم میرے راستہ میں حاضری کی طلب میں نکلے ہو، تم ان کے پاس دوستی کا خفیہ پیغام بھیجتے ہو اور میں خوب جانتا ہوں جو تم چھپاتے اور جو تم ظاہر کرتے ہو، تم میں سے جو یہ کرے وہ سیدھے راستہ سے بھٹک گیا، ان کا حال یہ ہے کہ اگر وہ تمہیں پالیں تو تمہارے دشمن بن جائیں، اور تمہارے خلاف اپنے ہاتھ اور زبان چلانے لگیں، وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ تم بھی کفر کی راہ اختیار کرو، قیامت کے دن تمہاری رشتہ داریاں اور تمہاری اولاد تمہارے کچھ کام نہ آئے گی، اور اللہ تمہارے درمیان جدائی ڈال دے گا، اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے)۔

قرآن مجید کی ان آیات کو اگر ان کے سیاق وسباق سے جوڑ کر دیکھا جائے تو یہ بات دنیا کے سامنے بالکل واضح طور پر سامنے آئے گی کہ ہر وہ قوم جو باغیرت ہو اور عزت کے ساتھ دنیا میں جینا چاہتی ہو، ان کے لئے ان حالات میں اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں، اور اس کے علاوہ کچھ اور نہیں کیا جاسکتا تھا۔

مولانا سید جلال الدین عمریؒ رقم طراز ہیں: اسلامی تاریخ کے بالکل ابتدائی دور کی یاد ذہن میں تازہ کیجئے جب کہ اس کی دعوت آہستہ آہستہ عام ہوتی گئی، اور مدینہ میں ایک چھوٹی سی اسلامی ریاست وجود میں آ گئی، اس واقعہ نے مخالفین کی صفوں میں اضطراب اور ہلچل پیدا کردی، اور مخالفت کی آندھی زیادہ شدت سے ہر طرف چلنے لگی، مشرکین اور یہود ونصاری اپنے

اپنے اختلافات کو بھول کر اسلام کے خلاف متحد ہوگئے، ہرطرح کی سازشوں کا ایک جال بچھا دیا گیا، اور مسلسل حالت جنگ قائم کردی گئی، اسلام اور مسلمانوں کو مٹانے کی جو بھی تدبیر کی جاسکتی تھی وہ بے دریغ اختیار کی جانے لگی۔

یہ کھلے دشمنوں کا حال تھا، دوسری طرف منافقین جو مفادات کے غلام تھے بظاہر اسلام کا دم بھرتے، اور مسلمانوں سے اپنی خیرخواہی اور اخلاص ومحبت کا اظہار کرتے تھے، لیکن دل سے مخالفین کے ساتھ ملے ہوئے تھے، انہیں ان کا پورا تعاون حاصل تھا اور وہ ان کے دم ساز اور غم خوار بنے ہوئے تھے۔

ان حالات میں مسلمانوں کو اسلام پر ثابت قدمی کی ہدایت کی گئی، دین وایمان کے تقاضے واضح کئے گئے، اور بتایا گیا کہ جو لوگ اسلام کے دشمن ہیں اور اسے بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکنا چاہتے ہیں، ان سے انہیں دور رہنا چاہئے، ان سے رازدارانہ تعلقات اور ذہنی قربت ویگانگت ایمان کے منافی ہے، منافقوں کے کردار سے بھی پردہ ہٹایا گیا، اور مخلص مسلمانوں سے کہا گیا کہ وہ ان کی پس پردہ سازشوں سے ہوشیار رہیں، یہ مار آستین کھلے دشمنوں سے زیادہ خطرناک ہیں۔

اسلام کے ان کھلے اور چھپے دشمنوں سے تعلقات ایمان کے منافی بھی تھے اور خالص سیاسی نقطہ نظر سے بھی بے حد مہلک اور تباہ کن تھے، اس سے اسلامی ریاست سنگین خطرات سے دوچار ہوسکتی تھی، اس کا تحفظ ضروری تھا، دنیا کی کوئی بھی حکومت دشمن سے تعلقات قائم کرنے، اس سے رازدارانہ معاملات کرنے، اسے خفیہ معلومات فراہم کرنے اور بالواسطہ یا بلاواسطہ اس کی سازشوں میں شریک ہونے کی ہرگز اجازت نہیں دے سکتی، مسلمانوں کو اپنے مخالفین سے تعلق نہ رکھنے کا قرآن مجید کی جن آیات میں حکم دیا گیا ان کے آگے پیچھے اور بعض اوقات انہی آیات میں اس کا پس منظر صاف موجود ہے (غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق، ص ۲۸۳-۲۸۴)۔

یہ ہیں وہ اسباب وعوامل اور ان کا پس منظر جن کے پیش نظر قرآن نے اپنے ماننے

والوں کو اس کا حکم دیا ہے جو کسی بھی باغیرت قوم اور ریاست کی مجبوری ہوتی ہے، اب اگر ان حالات میں غیروں سے قطع تعلق اور ان سے بیزاری کا حکم نہ دیا جائے تو اور کیا کیا جائے، جہاں تک بات رہی پڑوسیوں کی خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم، یا معاہد قوم یا جنگ سے غیر جانبداری کی تو اسلام ان سے قطع تعلق کا قطعا روادار نہیں ہے بلکہ ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کو واجب قرار دیتا ہے، ذیل میں ہم انہی آیات اور احادیث نبویہ اور علماء کے اقوال ذکر کرنے جا رہے ہیں۔

معاہد قوم کے ساتھ اسلام کا رویہ:

ارشاد باری تعالی ہے: "**لاینهاکم الله عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم أن تبروهم وتقسطوا إلیهم، إن الله یحب المقسطین، إنما ینهاکم الله عن الذین قاتلوکم فی الدین وأخرجوکم من دیارکم، وظاهروا علی إخراجکم أن تولوهم، ومن یتولهم فأولئک هم الظالمون**" (الممتحنہ:۸-۹)۔

(اللہ تعالی تمہیں منع نہیں کرتا ان لوگوں کے ساتھ حسن سلوک اور عدل وانصاف اور احسان کا رویہ اختیار کرنے سے، جنہوں نے تم سے دین کی وجہ سے جنگ نہیں کی، اور تمہیں تمہارے گھروں سے بے دخل نہیں کیا، اللہ تعالی تو منع کرتا ہے ان لوگوں کے ساتھ مودت کے تعلقات سے جنہوں نے تم سے دین کی وجہ سے جنگ کی اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا، اور تمہیں گھروں سے نکالنے میں مدد کی کہ تم ان کو اپنا ولی اور دوست بناؤ، جو انہیں دوست بنائیں گے وہی ظالم ہیں)۔

ان آیات میں واضح طور سے یہ حکم دیا گیا کہ عدم تعلق کا حکم صرف ان لوگوں سے دیا گیا ہے جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازش رچتے ہیں اور اسلامی ریاست کے لئے خطرہ بنتے ہیں، اور اسلامی ریاست کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنا چاہتے ہیں، رہے وہ لوگ جو اسلام سے دشمنی نہیں رکھتے اور مسلمانوں کے خلاف جنگ نہیں کرتے، اور مسلمانوں کو اپنے علاقہ سے

بے دخل کرنے کی کوشش نہیں کرتے تو ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور ان کے ساتھ تعلقات استوار کرنے، عدل ومساوات اور مصالحت وہمدردی کا رویہ اختیار کرنے سے اسلام منع نہیں کرتا۔

اسی طرح اگر کوئی غیر مسلم اسلامی ریاست میں اسلامی تعلیمات کو سمجھنے کے لئے پناہ لینا چاہے یا قیام کرنا چاہے تو اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اس کو تحفظ فراہم کرے، اور اگر اسلامی تعلیمات کو قبول نہ کرے تب بھی اسلامی ریاست اس کو اس کے گھر تک پہنچا دے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "**وإن أحد من المشركين استجارك فأجره حتى يسمع كلام الله ثم أبلغه مأمنه ذلك بأنهم قوم لا يعلمون**" (توبہ:٦) (اور اگر مشرکین میں سے کوئی تم سے پناہ طلب کرے تو اسے پناہ دو، یہاں تک کہ وہ ان کا کلام سن لے، پھر اسے اس کے مأمن تک پہنچا دو، یہ اس لئے ہے کہ یہ علم نہیں رکھتے)۔

علامہ جریر طبریؒ فرماتے ہیں کہ جن مشرکین سے جہاد کا حکم دیا گیا ہے انہی کے بارے میں یہ حکم بھی ہے کہ ان میں سے کوئی اسلام کو سمجھنے کے لئے پناہ کا طالب ہو تو اسے پناہ دی جائے، اگر وہ اسلام کو قبول نہ کرے تو بحفاظت اسے اس کے علاقہ میں پہنچا دے، اسلامی ریاست کا کوئی فرد اس سے اس مدت میں تعرض نہ کرے (جامع البیان ۱۴/ ۱۳۸ دار المعارف مصر)۔

علامہ قرطبی کہتے ہیں: اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ محارب قوم کا کوئی فرد قرآن مجید کو سمجھنے اور اس کے احکام سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے اسلامی ریاست سے پناہ کا طالب ہو تو اسے پناہ دی جائے گی، سب کچھ سننے اور سمجھنے کے بعد وہ اسلام قبول کر لے تو یہ بڑی اچھی بات ہوگی، اس کے بعد فرماتے ہیں: "**ظاهر الآية انما هى من يريد سماع القرآن والنظر فى الإسلام فأماالإجارة لغير ذلك فإنما هى لمصلحة المسلمين والنظر فى ماتعود عليهم به منفعة**" (الجامع لأحکام القرآن ۸/ ۷٦)۔

علامہ ابن قدامہ حنبلی نے اس آیت کے حوالہ سے لکھا ہے: اگر کوئی شخص کلام اللہ کو سننے

اور اسلامی شریعت کو جاننے کے لئے امان کا طالب ہوتو اسے امان دینا واجب ہے، پھر اسے اس کی منزل تک پہنچا دیا جائے گا، ہمارے علم کی حد تک اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے، یہی بات قتادہ، مکحول، امام اوزاعی، اور امام شافعیؒ نے کہی ہے، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے یہی بات لکھ کر اپنی مملکت میں بھیجوائی تھی (المغنی ۱۳/۷۹)۔

امام اوزاعی فرماتے ہیں کہ یہ حکم قیامت تک کے لئے ہے، سفیر قاصد، اور مستامن کے لئے عقد امان جائز ہے، رسول اللہ ﷺ مشرکین کے سفراء کو امان دیا کرتے تھے، یہاں تک کہ مسیلمہ کذاب کے سفیر آپ ﷺ کی خدمت میں آئے تو آپ ﷺ نے فرمایا سفیروں اور قاصدوں کے قتل کا دستور نہیں ہے ورنہ میں تم دونوں کو قتل کر دیتا، یہ ایک ضرورت بھی ہے، اگر ہم ان کے قاصدوں کو قتل کریں گے تو وہ ہمارے قاصدوں کے ساتھ یہی سلوک کریں گے پھر سفارت کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا (حوالہ سابق)۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن مجید اور اس کی تعلیمات کو سمجھنے کے علاوہ کسی اور مقصد سے بھی محارب قوم کا کوئی فرد اسلامی ریاست میں آنا چاہے تو اگر مسلمانوں کے مفاد کا تقاضہ ہو تو اسے اجازت دی جائے گی، جب تک وہ اسلامی ریاست میں ہے اس کی حفاظت اور پناہ میں ہوگا اور ریاست کی ذمہ داری ہوگی کہ اسے کوئی گزند نہ پہنچے اور ضرورت سے فارغ ہونے کے بعد اسے اس کی مملکت بعافیت پہنچنے کا نظم کرے۔

مذکورہ بالا سطور میں مستأمن سے متعلق کچھ باتیں ہم نے ذکر کی ہیں، اب ہم ذیل میں اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہیں اور وہ ہے غیر مسلم پڑوسیوں کے حقوق، قبل اس کے کہ غیر مسلم پڑوسیوں کے حقوق پر کچھ گفتگو کی جائے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اسلام عام انسانوں کے ساتھ خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم اس کے ساتھ کس طرح کے سلوک کا روادار ہے، ایا اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کے ساتھ کچھ اور رویہ رکھتا ہے اور غیر اسلامی ریاست میں کچھ اور، تو یہ بات ہر ایک کے گوش گزار ہونی چاہئے کہ اسلام کا عام رویہ خواہ وہ کسی بھی عقیدہ کا حامل ہو عدل و انصاف کا

ہے، کسی بھی حال میں تشدد اور زیادتی کا قائل نہیں ہے، ارشاد باری تعالی ہے: "**إن الله يأمربالعدل والإحسان وإيتاء ذى القربى وينهى عن الفحشاء والمنكر والبغى يعظكم لعلكم تذكرون**"(نحل:۹۰)۔

(بے شک اللہ حکم دیتا ہے عدل واحسان کا اور قرابت داروں کا حق ادا کرنے کا، اور منع کرتا ہے بے حیائی سے، منکر سے اور ظلم وزیادتی سے، وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو)۔

دوسری جگہ ارشاد ہے: "**قل أمرربى بالقسط**"(اعراف:۲۹)(کہہ دو میرے رب نے عدل وقسط کا حکم دیا ہے)۔

تیسری جگہ ارشاد ہے: "**وأوفوا الكيل والميزان بالقسط، لا نكلف نفسا إلا وسعها، وإذا قلتم فاعدلوا ولوكان ذاقربى**" (انعام:۱۵۲)(ناپ اور تول کو پورا کرو انصاف کے ساتھ، ہم کسی شخص پر اتنی ہی ذمہ داری ڈالتے ہیں جتنی اس میں طاقت ہے، اور جب کوئی بات کہو تو عدل وانصاف کے ساتھ کہو، چاہے معاملہ قرابت داری کا ہی کیوں نہ ہو)۔

اسی کو تھوڑا اور وضاحت کے ساتھ یوں بیان کیا گیا ہے: "**يأيها الذين آمنوا كونوا قوامين بالقسط شهداء لله ولوعلى أنفسكم أوالوالدين والأقربين، إن يكن غنيا أوفقيرا فالله أولى بهما فلا تتبعوا الهوى أن تعدلوا وإن تلووا أوتعرضوا فإن الله كان بما تعملون خبيرا**"(نساء:۱۳۵)۔

(اے ایمان والو عدل وقسط کو لے کر کھڑے ہو جاؤ، اللہ کے لئے گواہی دینے والے بنو چاہے اس کی زد تمہاری ذات پر پڑے یا والدین اور رشتہ داروں پر، اگر صاحب معاملہ مالدار یا غریب ہے تو اللہ ان کا تم سے زیادہ خیر خواہ ہے، لہذا تم خواہش کی اتباع نہ کرو کہ عدل سے پھر جاؤ، اگر تم زبان کو موڑ کر بات کرو یا اعراض کرو تو اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے باخبر ہے)۔

نیز ارشاد ہے: "**يأيها الذين آمنوا كونوا قوامين لله شهداء بالقسط،**

ولایجرمنّکم شنآن قوم علی أن لا تعدلوا، اعدلوا هو أقرب للتقوی، واتقوا الله إن الله خبیر بما تعملون"(مائدہ:۸)۔

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کے لئے کھڑے ہونے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بن کر رہو، کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس قدر مشتعل نہ کردے کہ تم انصاف نہ کرو، یہی بات تقوی سے زیادہ قریب ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے باخبر ہے)۔

اسی طرح ارشاد ہے: "**إن الله یأمرکم أن تؤدّوا الأمانات إلی أهلها ، وإذاحکمتم بین الناس أن تحکموا بالعدل، إن الله نعمّا یعظکم به إن الله کان سمیعا بصیرا**"(نساء:۵۸)۔

(بے شک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کو پہنچاؤ، اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو، اللہ تمہیں اچھی نصیحت کرتا ہے، بے شک اللہ سننے اور دیکھنے والا ہے)۔

الغرض اسلام عدل وانصاف کے معاملہ میں دوست ودشمن کی کوئی تفریق نہیں کرتا، وہ دشمنوں اور مخالفوں کے ساتھ عدل وقسط کو لازم قرار دیتا ہے، اور کسی بھی حال میں اس سے انحراف کی اجازت نہیں دیتا، اس معاملہ میں اس کی ہدایات اتنی واضح اور روشن ہیں کہ کوئی بھی ہوشمند اس سے انکار کی جرأت نہیں کرسکتا، اب اس کے بعد بھی کوئی فرد یا جماعت یا ریاست ان اصولوں کی مخالفت کرتا ہے تو اس سے اسلام کا کوئی لینا دینا نہیں ہے)۔

یہ تو معاملات میں عدل و انصاف کی بات ہے، اسلام تو اپنے عقیدہ وفکر کی نشر واشاعت میں بھی جبر واکراہ کا قائل نہیں ہے، بلکہ اس کے لئے وعظ ونصیحت اور افہام وتفہیم کی راہ اختیار کرنے کی دعوت دیتا ہے، اور دلائل وبراہین کے ذریعہ مخاطب کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس کے یہاں سرے سے جبر واکراہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے، چنانچہ فرماتا ہے: "**ادع**

إلى سبيل ربک بالحكمة والموعظة الحسنة، وجادلهم بالتى هى أحسن إن ربک هو أعلم بمن ضل عن سبيله وهو أعلم بالمهتدين"(نحل:۱۲۵)۔

(دعوت دو اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور عمدہ نصیحت کے ذریعہ اور مباحثہ کرو ان سے اس طریقہ سے جو بہتر ہے، بے شک تمہارا رب خوب جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹک گیا ہے، اور ان لوگوں کو بھی اچھی طرح جانتا ہے جو ہدایت یافتہ ہیں)۔

نیز ارشاد ہے:"**لا إكراه فى الدين قد تبين الرشد من الغي، فمن يكفر بالطاغوت ويؤمن بالله فقداستمسک بالعروة الوثقى لاانفصام لها، والله سميع عليم، الله ولى الذين آمنوا،يخرجهم من الظلمات إلى النور، والذين كفروا أولياء هم الطاغوت يخرجونهم من النور إلى الظلمات أولئک أصحاب النار هم فيها خالدون**"(بقرہ:۲۵۶تا۲۵۷)۔

(دین کے معاملہ میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے، بے شک ہدایت بالکل واضح ہوگئی ہے گمراہی سے، پس جو شخص طاغوت سے کفر کرے اور اللہ پر ایمان لے آئے اس نے مضبوط رسی پکڑ لی، جو ٹوٹنے والی نہیں ہے، اللہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے، اللہ ان لوگوں کا ولی ہے جو ایمان لائے، وہ انہیں ظلمتوں سے نکال کر روشنی کی طرف پہنچاتا ہے، جن لوگوں نے کفر کیا ان کے اولیاء طاغوت ہیں، وہ انہیں نور سے ظلمتوں کی طرف لے جاتے ہیں، یہ جہنم والے ہیں اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے)۔

سورۂ دہر میں ہے:"**إنا هديناه السبيل إما شاكرا وإما كفورا**"(دہر:۳)(بے شک ہم نے انسان کو راستہ دکھایا ہے، اب وہ چاہے شکر گزار بنے یا ناشکرا اور کافر)۔

سورہ کہف میں ہے:"**وقل الحق من ربكم، فمن شاء فليؤمن ومن شاء فليكفر**"(سورۂ کہف:۲۹)(کہہ دو حق تمہارے رب کی طرف سے آچکا ہے پس جو چاہے اس پر ایمان لائے اور جس کا جی چاہے کفر کا راستہ اختیار کرے)۔

ان آیات میں صاف اور واضح الفاظ میں کہا گیا ہے کہ اللہ تعالی کی طرف سے جو حق آیا ہے وہ بالکل واضح ہے، جس کا جی چاہے قبول کرے اور جس کا جی چاہے انکار کردے، اس کے بعد اس اقرار اور انکار کے انجام سے بھی آگاہ کردیا گیا ہے، تاکہ آدمی فیصلہ کرنے سے پہلے اچھی طرح سوچ لے کہ وہ کس انجام کو پسند کرتا ہے۔

مولانا سید جلال الدین عمریؒ صاحب لکھتے ہیں: اسلام ایک دعوتی اور تبلیغی دین ہے، جبر واکراہ اس کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہے، وہ اس نقطہ نظر کا حامل ہے کہ اللہ تعالی نے انسان کو مجبور نہیں پیدا کیا ہے، بلکہ اختیار اور آزادی سے نوازا ہے، حالانکہ اللہ تعالی چاہتا تو ہر فرد بشر کو اپنا تابع فرمان بنائے رکھتا، اور کسی میں اس کی نافرمانی کا یارانہ نہ ہوتا، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا، بلکہ اپنے پیغمبروں کے ذریعہ حق و باطل کو واضح کیا، اور انسان کو پوری آزادی دی کہ ان میں سے جو راہ چاہے اختیار کرے، اس آزادی کے صحیح استعمال اور اس کی کامیابی کا انحصار ہے، اس کا غلط استعمال اس کو دنیا و آخرت کی ناکامی سے دوچار کردے گا، یہ وہ زبردست مصلحت ہے جس کے لئے اللہ تعالی نے یہاں جبر نہیں رکھا ہے، اگر کوئی شخص اسلام کے لئے جبر و تشدد کا طریقہ اپناتا ہے تو اس مصلحت خداوندی کی خلاف ورزی کرتا ہے، اس مضمون کی بعض آیات یہاں پیش کی جارہی ہیں:

"**ولوشاء ربک لآمن من فی الأرض کلهم جمیعا، أفأنت تکره الناس حتی یکونوا مؤمنین** "(یونس:۹۹)(اگر تیرا رب چاہتا تو زمین میں جتنے لوگ ہیں سب کے سب ایمان لے آتے جب کہ اس نے یہ نہیں چاہا، تو کیا تم لوگوں کو مجبو کرو گے کہ وہ مومن ہوجائیں)۔

"**وما اکثر الناس ولوحرصت بمؤمنین**"(یوسف:۱۰۳)(اکثر لوگ، آپ کتنا ہی چاہیں ایمان لانے والے نہیں ہیں)۔

اس معاملہ میں اللہ کی سنت اور اس کا قانون اس طرح بیان ہوا ہے: "**ولو شاء الله**

لجعلكم أمة واحدة، ولكن يضل من يشاء ويهدى من يشاء ولتسئلن عما كنتم تعملون"(نحل:۹۳)۔

(اگر اللہ تعالی چاہتا تو تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا وہ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے، اور تم جو کچھ کر رہے تھے اس کے بارے میں تم سے ضرور پوچھا جائے گا)۔

سورۂ شوری میں یہی بات ان الفاظ میں کہی گئی ہے:"**ولو شاء الله لجعلهم أمة واحدة ولكن يدخل من يشاء فى رحمته، والظالمون مالهم من ولى ولا نصير**" (الشوری:۸)۔

(اگر اللہ چاہتا تو انہیں ایک امت بنا دیتا، لیکن وہ تو جسے چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے (اور جسے چاہتا ہے اس سے محروم کر دیتا ہے) ظالموں کا کوئی سرپرست اور مددگار نہ ہوگا)۔

محمد ﷺ اسلام کے داعی اعظم تھے، آپ ﷺ کے قلب مبارک میں یہ بے پناہ خواہش موجزن تھی کہ اللہ کے سارے بندے اسلام کی دولت سے بہرہ ور ہو جائیں، ان آیات میں کہا گیا ہے کہ اللہ تعالی نے یہ دنیا ایسی بنائی ہے کہ یہاں فکر و عمل کا اختلاف لازمار ہے گا، اور لوگوں کے طرز فکر اور طریقہ ہائے حیات جدا جدا ہوں گے، اس لئے آپ اپنی مقدس تمنا اور پاکیزہ خواہش کے باوجود انسانوں کے درمیان پائے جانے والے اختلاف کو ختم کر کے، سب کو اللہ کے دین کا پابند نہیں بنا سکتے، آپ کی ذمہ داری صرف اتنی ہے کہ حق واضح کر دیں، ہدایت اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہتا ہے صراط مستقیم پر چلاتا ہے، اور جسے چاہتا ہے ضلالت میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیتا ہے (غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق ص ۱۸۶ تا ۱۸۷)۔

اسلام کا دیگر مذاہب کے ساتھ رویہ:

اسلام جبر و اکراہ تو دور دوسرے مذاہب کے رہنماؤں پر تنقید کرنے کو بھی جائز نہیں

سمجھتا ہے، بلکہ ایسا کرنے والوں کی سخت نکیر کرتا ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالی ہے:"**ولا تسبوا الذين يدعون من دون الله فيسبوا الله عدوا بغير علم كذلك زينا لكل أمة عملهم ثم إلى ربهم مرجعهم فينبئهم بما كانوا يعملون**"(انعام:۱۰۸)۔

(یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں تم انہیں برا بھلا نہ کہو کہ وہ حد سے آگے بڑھ کر جہالت کی بنا پر اللہ تعالی کو برا بھلا کہنے لگیں، اسی طرح ہم نے ہر گروہ کو اس کا عمل خوشنما بنا دیا ہے، پھر انہیں اپنے رب کے پاس لوٹنا ہے، وہ انہیں بتائے گا کہ وہ کیا کر رہے تھے)۔

اسلام تو یہ بھی نہیں چاہتا کہ جو اس کی تضحیک کرے، اور اس کی مخالفت میں گندی زبان استعمال کرے اس کو اس زبان میں جواب دیا جائے؛ بلکہ اس کا جواب دینے میں تہذیب وشائستگی اور حسن سلوک کی راہ اختیار کرتا ہے، چنانچہ فرماتا ہے:

"**ولا تستوى الحسنة ولا السيئة ادفع بالتى هى أحسن فإذا الذى بينك وبينه عداوة كانه ولى حميم،وما يلقاها إلا الذين صبروا وما يلقاها إلا ذو حظ عظيم** "(فصلت:۳۴-۳۵)۔

(یکساں نہیں نیکی اور بدی، تم بدی کو دفع کرو اس طریقہ سے جو احسن ہو پھر تم دیکھو گے کہ تمہارے اور جس شخص کے درمیان دشمنی ہے گویا وہ جگری دوست ہے، یہ خوبی ان ہی کو ملتی ہے جو صبر کرتے ہیں، اور یہ مقام اسی کو حاصل ہوتا ہے جو بڑے نصیب والا ہے)۔

یہ تو اہل شرک کے ساتھ اسلام کا معاملہ تھا، اب آتے ہیں اہل کتاب کی طرف جن کا اسلام کے ساتھ بنیادی طور پر خدا اور رسول اور آخرت کو ماننے کے سلسلے میں اشتراک تھا، وہ اگرچہ اہل کتاب تھے لیکن بہت حد تک وہ اس میں تحریف کر چکے تھے، اسلام کا رویہ ان کے ساتھ کیسا ہے ذیل کی آیات سے اس کی وضاحت ہوتی ہے۔

۱-"**آمن الرسول بما أنزل إليه من ربه والمؤمنون، كل آمن بالله وملائكته وكتبه ورسله لا نفرق بين أحد من رسله**" (البقرہ:۲۸۵)۔

(رسول اس ہدایت پر ایمان لایا ہے جو اس پر اس کے رب کی طرف سے نازل ہوئی ہے اور اس کے ماننے والے بھی اس پر ایمان لائے ہیں، یہ سب ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں اور اس کے رسول پر، اور کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے رسولوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کرتے)۔

۲-"**إن الذين يكفرون بالله ورسله ويريدون أن يفرقوا بين الله ورسله ويقولون نؤمن ببعض ونكفر ببعض، ويريدون أن يتخذوا بين ذلك سبيلا، أولئك هم الكافرون حقا وأعتدنا للكافرين عذابا مهينا، والذين آمنوا بالله ورسله، ولم يفرقوا بين أحد منهم أولئك سوف يؤتيهم أجورهم وكان الله غفوراً رحيماً**" (نساء:۱۵۰-۱۵۱)۔

(اے پیغمبر کہو، اے اہل کتاب آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے، وہ یہ کہ ہم بندگی نہیں کریں گے مگر صرف اللہ کی اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے، اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو رب نہ بنائے، پھر اگر وہ اسے قبول نہ کریں، تو کہہ دو کہ گواہ رہو کہ تم تو مسلم (اللہ کی اطاعت کرنے والے) ہو)۔

"**ولاتجادلوا أهل الكتاب إلا بالتى هى أحسن إلا الذين ظلموا منهم وقولوا آمنا بالذى أنزل إلينا، وأنزل إليكم وإلٰهنا وإلٰهكم واحد ونحن له مسلمون**" (عنکبوت:۴۶)۔

(اور اہل کتاب سے بحث نہ کرو مگر اس طریقہ سے جو بہتر ہے، سوائے ان لوگوں کے جو ان میں ظالم اور بے انصاف ہیں، اور کہو کہ ہم ایمان رکھتے ہیں، اس کتاب پر جو ہماری طرف نازل کی گئی ہے، اور ہمارا اور تمہارا معبود ایک ہی ہے، اور ہم اسی کے مطیع و فرمانبردار ہیں)۔

"**قل يأهل الكتاب تعالوا إلى كلمة سواء بيننا وبينكم ألا نعبد إلا الله ولا نشرك به شيئا ولا يتخذ بعضنا بعضا أربابا من دون الله فإن تولوا فقولوا**

اشهدوا بأنا مسلمون"(آل عمران:۶۴)۔

(اے پیغمبر کہو اے اہل کتاب آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے، وہ یہ کہ ہم بندگی نہیں کریں گے مگر صرف اللہ کی اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے، اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو رب نہ بنائے، پھر اگر وہ اسے قبول نہ کریں تو کہہ دو کہ گواہ رہو کہ ہم تو مسلم (اللہ کی) اطاعت کرنے والے ہیں)۔

"**یا أیها الذین آمنوا آمنوا بالله ورسوله والکتاب الذی نزّل علی رسوله والکتاب الذی أنزل من قبل ومن یکفر بالله وملائکته وکتبه ورسله والیوم الآخر، فقد ضلّ ضلالاً بعیداً**"(نساء:۱۳۶)۔

(اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو ایمان لاؤ اللہ پر، اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر نازل کی، اور ہر اس کتاب پر جو اس نے اس سے پہلے نازل کی، جو شخص انکار کرتا ہے اللہ کا اس کے فرشتوں کا، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور آخرت کے دن کا تو وہ گمراہی میں بہت دور نکل گیا)۔

مذکورہ بالا آیات میں جن باتوں پر زور دیا گیا وہ یہ کہ اس زمین پر بسنے والے سارے انسان خواہ وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں آپس میں الفت ومحبت کے ساتھ رہیں، آپس میں کسی طرح کا کوئی تکدر کوئی بغض وعناد نہ ہو، البتہ اس کی کوشش کی جائے گی کہ کوئی بھی انسان ایسا عمل یا ایسی حرکت نہ کرے جس سے معاشرہ کے اندر اس کا وقار مجروح ہو یا مرنے کے بعد آخرت کی زندگی تباہ وبرباد ہو بالخصوص پڑوسی خواہ کوئی ہو اس کا اعتقاد کچھ بھی ہو، اسلام اس کی بہی خواہی اور ہمدردی کا خواہاں ہے، اس لئے کہ پڑوس کا معاملہ ایسا ہے کہ اگر آدمی پڑوس کے معاملہ میں مطمئن نہیں ہے تو ہر آن اور ہر لمحہ کرب وبے چینی میں مبتلا رہے گا، اور کسی پل اس کو سکون میسر نہیں رہے گا، نہ زمین وجائداد کے سلسلے میں اور نا ہی بیوی بچوں کی عزت وآبرو کے تحفظ کے سلسلے میں، اسی لئے اسلام میں پڑوسیوں کے حقوق کی ادائیگی کے بارے میں بڑی

تاکید آئی ہے، اوراس کے ساتھ ادنی بدسلوکی کو بڑے گناہ سے تعبیر کیا ہے، چنانچہ ارشاد نبوی ﷺ ہے:

"عن أبی هريرة أن رسول الله ﷺ قال:من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فلا يؤذی جاره"(متفق علیہ)(ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشادفرمایا کہ جواللہ پراور یوم آخرت پر یقین رکھتا ہواس کو چاہئے کہ اپنے پڑوسی کواذیت نہ پہنچائے)۔

اس روایت میں مطلق طور پر پڑوسی کا ذکر ہے، اس میں مسلم اور غیر مسلم کی کوئی قید نہیں ہے۔

دوسری روایت حضرت عائشہؓ سے ہے:"عن ام المؤمنين عائشةؓ وعبد الله بن عمرؓ قال :قال رسول الله ﷺ:ما زال جبرئيل يوصينی بالجار، حتی ظننت أنه يورثه "(متفق علیہ من حدیث ابن عمرؓ ورواہ مسلم من حدیث عائشہؓ)۔

(حضرت عائشہؓ اورابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشادفرمایا کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام برابر مجھے پڑوسیوں کے بارے میں وصیت کرتے رہے حتی کہ مجھے یہ خیال آنے لگا کہ کہیں ان کووارث نہ بنادیں)۔

امام بخاریؒ نے اپنی مشہور زمانہ کتاب ''الأدب المفرد''میں باب حق الجار کے تحت حضرت مقداد بن اسود سے روایت ذکر کی ہے:

"عن المقداد بن الأسود قال: سأل رسول الله ﷺ أصحابه عن الزنی، قالوا: حرام، حرمه الله ورسوله فقال: لأن يزنی الرجل بعشر نسوة أيسر عليه من أن يزنی بامرأة جاره، وسأله عن السرقة؟ قالوا:حرام، حرمه الله عزوجل ورسوله فقال: لأن يسرق من عشرة أهل أبيات أيسر عليه من أن يسرق من بيت جاره"۔

(حضرت مقداد بن اسودؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے اصحاب سے زنا سے متعلق سوال کیا تو صحابہ نے عرض کیا: حرام ہے، اللہ اور اس کے رسول نے اس کو حرام قرار دیا ہے، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ آدمی دس عورتوں سے زنا کرے یہ آسان ہے اس بات سے کہ آدمی اپنی پڑوسی کی بیوی سے زنا کرے، پھر آپ ﷺ نے صحابہ سے چوری کے بارے میں دریافت کیا، صحابہ نے عرض کیا: حرام ہے، اس کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے، پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ آدمی دس گھروں میں چوری کرے اتنا خطرناک نہیں ہے جتنا کہ آدمی اپنے پڑوسی کے گھر چوری کرے)۔

ان روایتوں کے علاوہ بہت ساری روایتیں ہیں جن میں بغیر کسی تفریق کے پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کو ایمان کی علامت قرار دیا گیا ہے، اور پڑوسیوں کو ایذاء دینا ایمان سے خارج قرار دیا ہے، ان میں چند روایتیں اور ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

امام بخاریؒ نے اپنی الجامع الصحیح میں نقل کیا ہے: "**والله لا يؤمن، والله لا يؤمن والله لا يؤمن قيل: ومن يا رسول الله؟قال: الذى لا يأمن جاره بوائقه**"۔

(خدا کی قسم وہ مومن ہو ہی نہیں سکتا، خدا کی قسم وہ مومن ہو ہی نہیں سکتا، خدا کی قسم وہ مومن ہو ہی نہیں سکتا، عرض کیا گیا: کون یا رسول اللہ ﷺ؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس کے شر سے اس کا پڑوسی محفوظ نہ ہو)۔ ایک اور روایت میں ہے: "**ليس المؤمن بالذى يشبع وجاره جائع إلى جنبه**" (الجامع الصحیح للترمذی عن عبداللہ بن عباس)۔

امام احمدؒ نے اپنی مسند کے اندر ابو ہریرہؓ سے نقل کیا ہے، فرماتے ہیں: "**قال رجل: يا رسول الله! إن فلانة يذكر من كثرة صلاتها وصيامها، وصدقتها غير أنها تؤذى جيرانها بلسانها قال: هى فى النار، قال: يا رسول الله، فإن فلانة يذكر من قلة صيامها وصدقتها وصلاتها وإنها تتصدق بالأثوار من الأقط ولا تؤذى جيرانها بلسانها؟قال هى فى الجنة**" (مسند احمد، حدیث: ۹۶۷۵)۔

(حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! فلانی عورت ہے جس کی نماز، روزہ اور صدقہ کرنے کی کثرت کا تذکرہ کیا جاتا ہے، لیکن اپنی زبان سے پڑوسیوں کو اذیت بھی پہنچاتی ہے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: وہ جہنمی ہے، پھر اس شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! فلانی عورت ہے جس کے روزہ، صدقہ اور نماز کی قلت کا تذکرہ کیا جاتا ہے اور تھوڑی بہت پنیر میں سے صدقہ بھی کرتی ہے لیکن اپنی زبان سے پڑوسیوں کو اذیت نہیں پہنچاتی ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ وہ جنتی ہے)۔

امام ترمذیؒ نے عبداللہ بن عمروؓ سے روایت نقل کیا ہے، فرماتے ہیں: ''**قال رسول الله ﷺ: خير الأصحاب عند الله خيرهم لصاحبه، وخير الجيران عندالله خيرهم لجاره**'' (حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کے نزدیک سب سے بہتر دوست وہ ہے جو اپنے دوست کے لئے بہتر ہو، اور سب سے بہتر پڑوسی وہ ہے جو اپنے پڑوسی کے لئے بہتر ہو)۔

ان تمام روایتوں میں مسلم وغیر مسلم پڑوسیوں کی قید کے بغیر واضح طور پر اس بات کا پیغام دیا گیا ہے کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے حتی کہ ایسے شخص کو ایمان سے خارج قرار دیا گیا ہے جو اپنے پڑوسی کو اذیت پہنچائے، اور اگر پڑوسی درپئے آزار ہو تو اس کی ایذاء رسانی پر صبر کرے، اور کچھ زیادہ ہی جبر واعتداء پر آمادہ ہو تو اپنا سامان گھر کے باہر کردے، اور اگر اس کے اندر تھوڑی بھی غیرت ہوگی تو از خود شرمندہ ہو کر آپ سے معذرت کرلے گا ورنہ جگہ تبدیل کردے۔

امام احمدؒ نے ابوذر غفاریؓ سے ایک روایت نقل کی ہے، کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''**إن الله يحب الرجل أن يكون له الجار يؤذيه جواره فيصبر على أذاه حتى يفرق بينهما موت أو ظعن**'' (تخریج شعیب الأرناؤط، حدیث نمبر: ۲۱۳۴۰)۔

(اللہ کو یہ بات پسند ہے کہ آدمی کا کوئی پڑوسی ہو اور وہ اس کو اذیت دے اور وہ اس پر

صبر کرے یہاں تک ان دونوں کے درمیان موت تفریق کردے یا وہاں سے کوچ کر جائے)۔

ایک دوسری روایت امام ابوداؤد نے حضرت ابو ہریرہؓ سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: ''**جاء رجل إلى النبى ﷺ فشكا إليه جارا له، فقال له النبى ﷺ ثلاث مرات: ''اصبر''، ثم قال الرابعة أو الثالثة: ''اطرح متاعک فى الطريق''، ففعل، قال: فجعل الناس يمرّون به ويقولون: مالک؟ فيقول: آذاه جاره، فجعلوا يقولون: لعنه الله، فجاء ه جاره فقال: ردّ متاعک، لا والله لاأوذيک أبدا**'' (حدیث نمبر:۲۵۵۹)۔

(ایک شخص نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے پڑوسی کی شکایت کی، تو حضور پاک ﷺ نے تین مرتبہ فرمایا: صبر کرو، پھر آپ ﷺ نے چوتھی یا تیسری دفعہ فرمایا: اپنے سامان کو راستہ میں ڈال دو، چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا: راوی کہتے ہیں کہ لوگ وہاں سے گذرتے اور کہتے کہ تمہیں کیا ہوا؟ تو وہ کہتا کہ اس کے پڑوسی نے اسے ستایا ہے تو لوگ کہنے لگے: اللہ کی لعنت ہو، چنانچہ اس کا پڑوسی آیا اور کہا کہ اپنے سامان کو اپنے گھر رکھو، خدا کی قسم اب میں کبھی تم کو اذیت نہیں دوں گا)۔

غیر مسلم پڑوسیوں کے ساتھ رسول اللہ ﷺ، صحابہ کرام اور اسلاف کا معاملہ:

تاریخی اعتبار سے اگر حقائق کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات اظہر من الشّمس ہوگی کہ خود رسول اللہ ﷺ نے اور آپ ﷺ کے بعد صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین اور پھر ان کے بعد مسلمانوں نے غیر مسلم پڑوسیوں کے ساتھ جس حسن سلوک کو برتا تاریخ ان کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے، مکہ میں جب آپ کو اللہ کی وحدانیت کا اقرار کرنے، حشر ونشر پر ایمان لانے، اچھائیوں کے برتنے اور برائیوں سے اجتناب کی دعوت عام کرنے کا مکلّف بنایا گیا، تو جتنی سعید روحیں تھیں یکے بعد دیگرے حق کی اس صدا پر لبیک کہتی رہیں، لیکن بدروحوں نے حق کے

خلاف وہ طوفان بدتمیزی برپا کی جس کے تصور ہی سے دل کانپ اٹھتا ہے، اور کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے، ایک طرف جوں جوں آپ ﷺ کے دل میں قوم کو جہنم کی آگ سے بچانے، اور دنیا وآخرت میں کامیابی کی دولت سے سرفراز ہونے کا جذبہ کارفرما ہوتا اور دن رات اسی فکر میں گھلتے رہتے کہ کس طرح قوم ہلاکت سے بچ جائے حتی کہ فرمان باری نازل ہوا:"**لعلک باخع نفسک علی آثارھم**" (شاید آپ ان کے پیچھے اپنے آپ کو ہلاک کردیں گے) تو قوم اسی قدر آپ ﷺ کے خلاف بغاوت، ہٹ دھرمی وسرکشی کے جذبہ سے آگے بڑھتی، اور آپ ﷺ کو اذیت دینے اور آپ ﷺ کی دل آزاری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ چھوڑتی، اور تو اور خود آپ ﷺ کے پڑوسی ورشتہ دار جن میں ابوجہل، ابولہب اور اس کی بیوی ام جمیل، عقبہ بن ابی معیط نے آپ ﷺ کو تکلیف پہنچانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی، آپ ﷺ کے گھر کے سامنے کوڑا ڈالتے، آپ ﷺ کی گردن اونٹ کی اوجھڑی سے گراں بار کرتے، آپ ﷺ نے ان تمام اذیتوں پر صبر کیا، اور کبھی برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیا۔

امام بخاری نے عروہ بن زبیرؓ سے نقل کیا ہے وہ کہتے ہیں: "**سألت عبد الله بن عمرو بن العاص: أخبرني بأشد شئ صنعه المشركون بالنبی ﷺ قال: بينا النبی ﷺ يصلی فی حجر الكعبة۔ إذا أقبل عقبة بن أبی معيط، فوضع ثوبه فی عنقه، فخنقه خنقا شديدا، فأقبل ابوبكر حتی أخذ بمنكبه، ودفعه عن النبی ﷺ قال: أتقتلون رجلا أن يقول ربی الله**" (الآیۃ غافر، باب ماالقی النبی وأصحابہ من المشرکین بمکۃ کتاب مناقب الأنصار، حدیث نمبر: ۴۸۱۰)۔

(حضرت عروہ بن زبیرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے پوچھا: مجھے بتایئے کہ مشرکوں نے رسول اللہ ﷺ کو سب سے سخت تکلیف کس چیز کے ذریعہ دی؟ تو انہوں نے کہا: اس دوران کہ نبی اکرم ﷺ کعبہ کے صحن میں نماز پڑھ رہے تھے کہ عقبہ بن ابی معیط آیا اور آپ ﷺ کی گردن میں کپڑا ڈال کر بری طرح سے گھسیٹا، اتنے میں حضرت ابوبکرؓ

تشریف لے آئے، اور نبی اکرم ﷺ سے اس کو ہٹایا، اور فرمایا کہ کیا تم ایسے شخص کو قتل کرنا چاہتے ہو جو کہتا کہ میرا رب اللہ ہے)۔

دوسری روایت بھی عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ ہی سے منقول ہے کہتے ہیں: ''**بینا النبی ﷺ: ساجد وحوله ناس من قریش جاء عقبة بن أبی معیط بسلی جزور فقذفه علی ظهر النبی ﷺ فلم یرفع رأسه فجاء ت فاطمة علیها السلام فأخذته من ظهره ودعت علی من صنع فقال النبی ﷺ اللهم علیک الملأ من قریش، أبا جهل بن هشام، وعتبة بن ربیعة وشیبة بن ربیعة وأمیة بن خلف، أوأبی بن خلف، شعبة الشاک، فرأیتهم قتلوا یوم بدر فألقوا فی بئر غیر أمیة بن خلف أو أبی تقطعت أوصاله فلم یلق فی البئر**''(باب سابق ومسلم، حدیث:۱۷۹۴)۔

(اس دوران کہ نبی اکرم ﷺ سجدہ ریز تھے اور ان کے آس پاس قریش کے کچھ لوگ جمع تھے کہ عقبہ بن ابی معیط اونٹ کی اوجھڑی لے کر آ گیا اور آپؐ کی پیٹھ پر پھینک دیا جس کی وجہ سے آپ سر نہیں اٹھا پا رہے تھے، کہ حضرت فاطمہؓ آئیں اور آپ کی پشت مبارک سے اوجھڑی ہٹایا، اور جس ملعون نے یہ حرکت کی اس کے خلاف بددعا کی، پھر آپ ﷺ نے قریش کے سرداروں ابوجہل بن ہشام، عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، امیہ بن خلف یا ابی بن خلف کے بارے میں فرمایا: اے اللہ تو ہی ان سے نپٹ؛ چنانچہ میں نے ان کو دیکھا کہ وہ سب بدر کے معرکہ میں مارے گئے اور سب کے سب گڈھے میں ڈال دیئے گئے، سوائے امیہ بن خلف یا ابی بن خلف کے؛ کیونکہ اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تھے جس کی وجہ سے گڈھے میں نہیں ڈالا جا سکا۔

یہ تو مکہ کی بات تھی اور آپ کے عزیز رشتہ دار پڑوسیوں کی تھی، رہی بات مدینہ کی تو مدینہ میں آپ کا ایک یہودی پڑوسی تھا، آپ کا اس کے ساتھ کس طرح کا معاملہ تھا، اور کس درجہ آپ نے اس کے ساتھ حسن سلوک اور غمگساری کا معاملہ کیا، مصنف ابن عبد الرزاق اور نصب

الرایۃ للزیلعی کی ان دونوں روایتوں کو تھوڑے فرق کے ساتھ ملاحظہ فرمائیں:

"عن ابن أبی حسین: أن النبی ﷺ کان له جار یهودی فمرض فعاده رسول الله ﷺ بأصحابه فعرض علیه الشهادتین ثلاث مرات، فقال له أبوه فی الثالثة: قل ما قال لک، ففعل، ثم مات، فأرادت الیهود أن تلیه، فقال رسول الله ﷺ: نحن أولی به، وغسله النبی ﷺ وکفنه وحنطه، وصلی علیه"۔

(ابن ابی حسین سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا ایک یہودی پڑوسی تھا، ایک دفعہ بیمار ہوا تو نبی اکرم ﷺ اپنے اصحاب کے ساتھ اس کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے، اور آپ نے اس پر تین مرتبہ شہادتین کو پیش فرمایا، تو یہودی کے باپ نے تیسری دفعہ کہا: نبی ﷺ جو فرمارہے ہیں وہ کہہ دو، چنانچہ اس نے کہہ دیا، پھر اس کا انتقال ہوگیا، تو یہودیوں نے چاہا کی اس کی تجہیز وتکفین کرلیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہم اس کے زیادہ مستحق ہیں، چنانچہ نبی کریم ﷺ نے خود اس کو غسل دیا، اور اس کو کفن پہنایا اور اس پر حنوط ملا، اور اس پر نماز جنازہ ادا کی)۔

نصب الرایہ کی روایت جو کتاب الآثار سے منقول ہے: **"عن ابن بریدة عن أبیه قال: کنا جلوسا عند النبی ﷺ فقال لنا: قوموا بنا نعود جارنا الیهودی، قال: فأتیناه، فقال علیه السلام: کیف أنت یا فلان؟ ثم عرض علیه الشهادتین ثلاث مرات، فقال له أبوه فی الثالثة: یابنّي اشهد، فشهد، فقال علیه السلام: الحمد لله الذی أعتق بی نسمة من النار"۔**

(بریدہؓ سے روایت ہے کہتے ہیں: ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بیٹھے تھے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: چلو ہم اپنے یہودی پڑوسی کے یہاں اس کی عیادت کو چلیں، راوی کہتے ہیں: چنانچہ ہم لوگ اس کے پاس آئے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: فلاں تم کیسے ہو؟، پھر آپ ﷺ نے اس پر تین مرتبہ کلمہ شہادتین پیش فرمایا، تیسری دفعہ میں اس کے باپ نے اس سے کہا: بیٹے گواہی دے دے، چنانچہ اس نے کلمہ پڑھ لیا، آپ ﷺ نے فرمایا: الحمدللہ، اللہ

نے میری وجہ سے ایک انسان کو جہنم کی آگ سے بچالیا)۔

گوکہ سندی اعتبار سے یہ دونوں روایتیں متکلم فیہ ہیں، ابن السنی نے اپنی کتاب (عمل الیوم واللیلۃ) کے باب مایقول لمرضیٰ أہل الکتاب وغیرہ میں ''اسنادہ ضعیف کہا ہے''، عقیلی نے الضعفاء الکبیر میں اسنادہ ضعیف کہا ہے، اسی طرح جوزقانی نے بھی اپنی کتاب ''الأباطیل والمناکیر'' (۲/۱۹۵) میں اور امام دارقطنی نے اپنی کتاب ''العلل'' (۱۲/۳۱،۳۲) میں اسی طرح کا خیال ظاہر کیا ہے۔

لیکن اسی سے ملتی جلتی ایک روایت امام بخاری، ابوداؤد، و امام احمد نے بھی ذکر کی ہے۔

''عن أنس رضی اللہ عنہ قال: کان غلام لیهودی یخدم النبی ﷺ فمرض فأتاه النبی ﷺ یهودی، فقعد عند رأسه فقال له: أسلم،فنظر إلى أبيه وهو عنده، فقال له: أطع أبا القاسم، فأسلم، فخرج النبی ﷺ وهو يقول: الحمد لله الذی أنقذه من النار''(رواہ البخاری، کتاب الجنائز، باب إذا أسلم الصبی فمات، ہل یصلی علیہ وہل یعرض علی الصبی الإسلام، حدیث نمبر:۱۳۵۶، ابوداؤد، کتاب الجنائز، باب عیادۃ الذمی، حدیث نمبر:۳۰۹۵، مسند احمد، حدیث نمبر:۱۳۵۶۵)۔

(حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہتے ہیں: ایک یہودی کا لڑکا تھا جو نبی اکرم ﷺ کی خدمت کیا کرتا تھا، وہ بیمار پڑ گیا، نبی اکرم ﷺ اس کے یہاں تشریف لے گئے، اور اس کے سر کے پاس بیٹھ گئے، اور آپ ﷺ نے فرمایا: اسلام لے آؤ، تو اس نے اپنے باپ کی طرف دیکھا، جو اس کے پاس ہی تھا تو باپ نے کہا: ابوالقاسم کی بات مان لے، تو وہ اسلام لے آیا، نبی اکرم ﷺ وہاں سے نکلے اس حال میں کہ آپ ﷺ فرمار ہے تھے: تمام تعریفات اس اللہ کے لئے جس نے اس کو جہنم کی آگ سے بچالیا)۔

ممکن ہے کہ اسی یہودی لڑکے کا باپ آپ ﷺ کا پڑوسی ہو، اور آپ کے حسن کردار وبلند اخلاق سے متأثر ہوکر اپنے بچے کو آپ کی خدمت میں لگا دیا ہو۔

صحابہ کرامؓ کا معمول:

امام ابوداؤد نے حضرت عبداللہ بن عمرو کا واقعہ نقل کیا ہے کہ ان کا معمول تھا کہ جب بھی بکری ذبح کرتے تو پوچھتے کہ کیا میرے یہودی پڑوسی کو گوشت بھجوایا۔

"عن عبد الله بن عمرو بن العاصؓ أنه ذبح شاة فقال: أهديتم لجاری اليهودی فإنی سمعت رسول الله ﷺ يقول: ما زال جبرئيل يوصينی بالجار حتی ظننت أنه سيورثه" (باب حق الجوار، کتاب الأدب، حدیث نمبر: ۵۱۵۲، الترمذی، حدیث نمبر: ۱۹۴۳، کتاب البر والصلۃ، باب ماجاء فی حق الجار)۔

(حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک بکری ذبح کی تو اپنے گھر والوں سے پوچھا کہ کیا تم لوگوں نے میرے یہودی پڑوسی کو بھیجا؟ اس لئے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ حضرت جبرئیل مجھے برابر پڑوسیوں کے سلسلے میں وصیت کرتے رہے یہاں تک کہ مجھے گمان ہونے لگا کہ شاید آپ اس کو وارث بنادیں)۔

اس روایت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام نے بھی پڑوسی کا مطلب مطلق پڑوسی سمجھا، اس میں کسی مسلم غیر مسلم کی تفریق نہیں کی۔

اسی طرح کا ایک واقعہ عبداللہ بن مبارک کا بھی ہے، جب وہ خراسان میں قیام پذیر تھے، تو عبداللہ بن مبارک کا ایک یہودی پڑوسی تھا، جو آپ کے بھائی کی طرح تھا، جب بھی آپ اپنے بچوں کے لئے کچھ لاتے تو یہودی پڑوسی کے بچوں کے لئے بھی خریدتے اور جب اپنے بچوں کے کپڑے خریدتے تو یہودی پڑوسی کے بچوں کے لئے بھی خریدتے، یہی وجہ ہے کہ جب یہودی پڑوسی کو کسی مجبوری کی وجہ سے اپنا مکان بیچنے کی ضرورت پیش آئی تو اس نے اپنے مکان

کی قیمت دو ہزار درہم رکھا، خریداروں نے پوچھا کہ تمہارا مکان ایک ہزار درہم کے برابر ہے تو اس نے کہا کہ ہاں، اور ایک ہزار درہم عبداللہ بن مبارک کے جوار کی قیمت ہے، جب عبداللہ بن مبارک کو اس کی اطلاع ہوئی تو ان کی آنکھیں اشک بار ہوگئیں، اور دعا کی: ''**اللھم إھدہ إلی الإسلام**'' ابھی ان کی دعا کے چند لمحے نہیں گذرے کہ وہ یہودی فوراً ایمان سے منور ہوگیا) (دروس الشیخ عائض بن عبداللہ القرنی ۶/ ۸۰)۔

خلاصہ کلام:

اوپر دی گئیں آیات وروایات اور سلف کے واقعات سے جو چیزیں واضح ہوکر سامنے آتی ہیں وہ یہ کہ پڑوسی خواہ مسلم ہو یا غیر مسلم درج ذیل حقوق کا مستحق ہوتا ہے:

۱- پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کرنا خواہ قولاً ہو یا عملاً۔

۲- پڑوسی کی حمایت کرنا اور اس کو امن وتحفظ دینا۔

۳- اس کی عدم موجودگی میں اس کا دفاع کرنا، اور اگر اس کے پیٹھ پیچھے اس کی کوئی غیبت کرے تو اس سے اس کو روکنا۔

۴- مسرت وشادمانی کے موقع پر اس کو اس میں شریک کرنا، البتہ ان کے تہواروں پر تحائف کا لین دین تو اس سلسلے میں کچھ تفصیلات ہیں۔

بنیادی طور پر تحفہ کا لین دین آپس میں الفت ومحبت قائم کرنے کا ذریعہ قرار دیا ہے، بالخصوص پڑوس کے ساتھ تحائف کا تبادلہ کچھ زیادہ ہی مفید ہوتا ہے، چنانچہ امام مالکؒ نے عطاء بن ابی مسلم عبداللہ الخراسانی سے روایت نقل کی ہے، وہ کہتے ہیں: ''**قال رسول اللہ** ﷺ: **تصافحوا یذھب الغل وتھادوا تحابوا، وتذھب الشحناء**'' (المؤطا، باب فی المہاجرہ)۔

(حضور ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: آپس میں مصافحہ کیا کرو بغض ختم ہوجائے گا، ایک دوسرے کو ہدیہ دیا کرو آپس میں محبت ہوگی، اور عداوت وکینہ چلا جائے گا)۔

اس روایت کو امام بخاری نے ''الأدب المفرد'' میں اور امام بیہقی نے اپنی سنن کے اندر ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے، لیکن ان کے الفاظ صرف ''**تهادوا تحابوا**'' ہیں۔

ایک دوسری روایت ہے جس کو امام بخاری نے نقل کیا ہے جس میں آپ ﷺ ارشاد فرمارہے ہیں: ''**لودعيت إلى ذراع أو كراع لأجبت، ولوأهدى إلى ذراع أو كراع لقبلت**'' (بخاری، کتاب النکاح، باب من أجاب الی کراع)۔

(اگر مجھے بکری کے ایک بازو یا اس کے کھر کی دعوت دی جائے تو میں اس پر لبیک کہوں گا، اور اگر مجھے کوئی بکری کا ایک بازو یا پائے ہدیہ میں دی جائے تو میں قبول کروں گا)۔

ہدیہ اور تحفہ کی دو شکلیں ہیں: ایک تو یہ ہے کہ عام حالات میں دیئے جاتے ہیں، خواہ تعلقات کی استواری کے لئے یا سیاسی اغراض کے حصول کے لئے، اس طرح کے ہدایا وتحائف کے لین دین میں مسلم اور غیر مسلم کی کوئی قید نہیں ہے، خود حضور ﷺ نے غیر مسلموں کے ہدایا وتحائف کو قبول فرمایا، اور آپ ﷺ نے بھی غیر مسلموں کو ہدیہ دیا، بطور مثال چند نمونے پیش خدمت ہیں:

حضرت علیؓ فرماتے ہیں: ''**إن كسرى أهدى له فقبل، وإن الملوك أهدوا إليه فقبل منهم**'' (ترمذی، ابواب السیر، باب ماجاء فی قبول ہدایا المشرکین، حدیث نمبر: ۱۵۷۶)۔

(حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کی خدمت میں کسری نے ہدیہ بھیجا اور آپ ﷺ نے قبول فرمایا، اور بادشاہوں نے بھی آپ ﷺ کی خدمت میں ہدایا پیش کئے اور آپ ﷺ نے ان کے ہدایا قبول فرمائے۔

حضرت علیؓ ہی سے مروی ایک دوسری روایت میں ''**وأهدى له قيصر**'' کا اضافہ بھی ہے (مسند احمد، حدیث نمبر: ۷۴۷)۔

لیکن ان دونوں میں ایک راوی ثویر بن ابی فاختہ ہیں جن کی کنیت ابوجہم ہے، ان کو محدثین نے ضعیف کہا ہے۔

اور دوسری بہت سی صحیح حدیثیں موجود ہیں جن سے آپ ﷺ کا ہدیہ قبول کرنے کا ثبوت ملتا ہے، مثلاً:

"عن أنسؓ إن أكيدر دومة أهدى إلى النبى ﷺ جبة سندس وكان ينهى عن الحرير فعجب الناس منها، فقال ﷺ:والذى نفس محمد بيده لمناديل سعد بن معاذ فى الجنة أحسن من هذا" (رواہ البخاری، کتاب الہبۃ، باب قبول الہدیۃ من المشرکین)۔

(حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ اکیدر دومہ نے نبی اکرم ﷺ کو ایک ریشمی جبہ ہدیہ میں بھیجا، لوگ اسے تعجب سے دیکھنے لگے تو آپ ﷺ نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے، جنت میں سعد بن معاذ کے رومال اس سے عمدہ ہیں)۔

اسی طرح مصر کے حاکم مقوقس کا واقعہ مشہور ہے جن کی طرف سے نبی اکرم ﷺ نے ۶ھ میں حاطب بن ابی بلتعہ کو دعوتی خط دے کر ارسال فرمایا تھا جس کے جواب میں اس نے خط کے ساتھ دو باندیاں ماریہ قبطیہ اور ان کی بہن سیرین جو حسین ترین باندیوں میں سے تھیں، ان میں سے ماریہ کو آپ ﷺ نے اپنی ملکیت میں رکھا جن سے حضرت ابراہیم پیدا ہوئے، اور سیرین کو حضرت حسان بن ثابتؓ کو عنایت فرمایا جن سے عبدالرحمٰن بن حسان پیدا ہوئے، ان کے علاوہ ایک ہزار مثقال سونا، بیس عدد ملائم کپڑے، ایک خچر جس کا نام دُل دُل تھا، ایک گدھا جسے عفیر یا یعفور کہا جاتا تھا اور مابور نامی غلام جو حضرت ماریہؓ کا چچازاد بھائی تھا، مقوقس نے ان دونوں کے تحفظ کے لئے بھیجا تھا۔

"لما كانت سنة ست من مهاجر رسول الله ﷺ ورجع من الحديبية بعث إلى الملوك، فبعث حاطب بن أبى بلتعة إلى المقوقس، وذكر أن المقوقس لما أتاه الكتاب ضمه إلى صدره وقال:هذا زمان يخرج فيه النبى الذى نجد نعته فى كتاب الله، وإنا نجد من نعمته أنه لا يجمع بين أختين، وأنه

يقبل الهدية ولا يقبل الصدقة، وأن جلسا ء ه المساكين ثم دعا رجلا عاقلا، فلم يجد بمصر أحسن ولا أجمل من مارية وأختها فبعث بهما إلى رسول الله، وبعث بغلة شهباء، وحمارا أشهب، وثيابا من قباطى مصر، وعسلا من عسل بنها وبعث إليه بمال وصدقة"۔

وبعث بذلک كله مع حاطب بن أبى بلتعة، فعرض حاطب بن أبى بلتعة على مارية الإسلام ورغبها فيه، فأسلمت، وأسلمت أختها سيرين ولما وصل المدينة قدم الأختين والدابتين، والعسل، والثياب، وأعلمه أن ذلک كله هدية، فقبل رسول الله ﷺالهدية، ولما نظر إلى مارية وأختها اعجبتاها وكره أن يجمع بينهما فوهب أختها سيرين لحسان بن ثابت، فولدت له عبد الرحمن"(الاستیعاب فی أسماء الأصحاب ۴/ ۴۱۰ تا ۴۱۳:ابن عبد البر، أسد الغابۃ ۱/ ۴۳۲ تا ۴۳۳، السیرۃ النبویۃ ۴/ ۶۰۰:ابن کثیر)۔

اسی طرح آپ ﷺ نے بھی غیر مسلموں کو ہدایا وتحائف بھیجوائے، ملک ذی یزن جو قبیلہ حمیر کا بادشاہ تھا کو ایک حلہ جس کی قیمت بیس اونٹوں سے زیادہ تھی خریدا اور اس کو تحفہ میں بھیجا، امام ابوداؤد نے اپنی سنن کے اندر اس کو یوں بیان فرمایا ہے:

"عن اسحاق بن عبد الله بن الحارث أن رسول الله ﷺ اشترى حلة ببضعة وعشرين قلوصا فأهداها إلى ذى يزن"(کتاب اللباس، باب لبس المرتفع، حدیث نمبر:۴۰۳۵)۔

(اسحاق بن عبداللہ بن حارث سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک جوڑا خریدا جس کی قیمت بیس اونٹ سے زیادہ تھی اور اس کو ملک ذی یزن کو ہدیہ میں بھیج دیا)۔

یہ روایت مرسلاً منقول ہے اور اس میں ایک راوی علی بن زید مختلف فیہ ہیں (عون المعبود ۴/ ۷۹)، اسی طرح کا تحفہ ملک ذی یزن بھی آپ ﷺ کی خدمت میں ارسال کر چکا تھا

جس کی مکافات کے لئے آپ ﷺ نے ہدیہ بھیجا تھا، ان کے علاوہ بہت سارے واقعات ہیں جن میں ہدیہ لینے اور دینے کا ذکر ہے، البتہ بعض ہدیہ آپ ﷺ نے رد بھی فرمائے ہیں، ان میں ابو عامر بن مالک جن کو ملاعب الأسنۃ بھی کہا جاتا ہے، کا ہدیہ، اسی طرح عیاض بن حمار کا ہدیہ جنہوں نے بطور ہدیہ ایک اونٹ پیش کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا تم اسلام لے آئے ہو؟ جب انہوں نے نفی میں جواب دیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''**إنی نهیت عن زبد المشرکین**'' (ابوداؤد، کتاب الخراج، باب فی الإمام، یقبل ہدایا المشرکین، حدیث نمبر: ۳۰۵۷، ترمذی، ابواب السیر، باب ماجاء فی قبول ہدایا المشرکین، حدیث نمبر: ۱۵۷۷، روض الأنف ۲/ ۳۲۱)۔

(مجھے مشرکوں کے عطیات لینے سے منع کیا گیا ہے)۔

اس باب میں چونکہ روایتیں دونوں طرح کی ہیں، اس لئے علماء نے اس سلسلے میں مختلف باتیں کہی ہیں، بعض کہتے ہیں: ممانعت والی حدیثیں قبول کرنے والی حدیثوں کو منسوخ کرنے والی ہیں، بعض کہتے ہیں: قبول کرنے والی حدیثیں ممانعت والی حدیثوں کو منسوخ کرنے والی ہیں، بعض کہتے ہیں: غیر مسلموں سے ہدیہ قبول کرنے کی اجازت صرف آپ کے ساتھ خاص ہے، دوسروں کو اس کی اجازت نہیں ہے، لیکن اس تخصیصیت کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے، اور جب تک تخصیص ثابت نہ ہو آپ کا اسوہ سب کے لئے ہے۔

کچھ لوگوں نے اہل کتاب اور مشرکین کے درمیان تفریق کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے نجاشی کا ہدیہ قبول کیا جو نصرانی تھا، لیکن یہ بات بھی کسی طرح درست نہیں؛ کیونکہ آپ ﷺ نے جب مکہ میں قحط پڑا تو آپ ﷺ نے پانچ سو درہم بھیجے اور آپ نے بھی ان سے کچھ چیزیں طلب کیں، اسی طرح مسند احمد و ترمذی کی روایت اوپر گذر چکی جس میں ہے کہ کسری نے آپ ﷺ کو ہدیہ بھیجا اور آپ ﷺ نے قبول فرمایا، اور کسری مجوسی تھا۔

اس مسئلہ میں صحیح رائے وہ ہے جو مولانا سید جلال الدین عمری صاحب نے دی ہے اور وہی جمہور کی رائے ہے، وہ یہ ہے کہ اس معاملہ میں رسول اکرم ﷺ کے پیش نظر اسلام اور

مسلمانوں کا مفاد رہا ہے، آپ ﷺ نے جن لوگوں کے بارے میں دیکھا کہ انکے ہدایا قبول کرنے سے ان کی تالیف قلب ہوگی، اور وہ اسلام کی طرف مائل ہوں گے ان کے ہدایا قبول فرمائے، اور انہیں جواباً ہدیئے اور تحفے بھی دیئے، لیکن جہاں اس طرح کی مصلحت نہیں تھی وہاں آپ ﷺ نے ہدیئے رد بھی کر دیئے (غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق ص ۱۵۸، مزید تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو: شرح النووی ۴/ ۱۲، ص ۱۱۴، فتح الباری ۵/ ۲۷۳)۔

ہدیہ کی دوسری شکل وہ ہے جو عید یا تہواروں کے موقعہ پر بھیجی جاتی ہے، جہاں تک بات ہے مسلمانوں کے اپنے عید کے موقعہ پر ہدیہ دینے کی تو یہ کوئی مختلف فیہ مسئلہ نہیں ہے، لیکن کیا غیر مسلم پڑوسی کی طرف سے ان کے تہواروں کے موقعوں پر دیئے گئے ہدیے وتحائف لینا جائز ہے؟

اس سلسلے میں صحابہ کرامؓ سے اور متأخرین علماء عظام سے دو طرح کے اقوال منقول ہیں، مثلاً حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ کسی غیر مسلم نے ان کی خدمت میں نوروز کا ہدیہ پیش کیا تو آپ نے قبول کر لیا (اقتضاء الصراط المستقیم ص ۱۲۰، ابن تیمیہ)۔

علامہ ابن تیمیہؒ نے مصنف ابن ابی شیبہ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ ایک عورت نے حضرت عائشہؓ سے عرض کیا کہ مجوسیوں سے ہمارے تعلقات ہیں، اور اس کے وجہ سے وہ اپنے تہوار کے موقعہ پر ہمیں ہدیہ بھیجتے ہیں، حضرت عائشہؓ نے فرمایا: اس دن جو ذبیحے ہوتے ہیں ان کا اگر گوشت وغیرہ ہو تو نہ کھاؤ، البتہ پھل وغیرہ کھا سکتی ہو) (حوالہ سابق)۔

اسی طرح صحابی رسول حضرت ابو برزہ اسلمیؓ سے منقول ہے کہ مجوسیوں سے ان کے بعض روابط تھے، ان کے پڑوس میں وہ لوگ آباد تھے جو نیروز اور مہرجان کے موقعہ پر تحفے وغیرہ بھیجا کرتے تھے، وہ اپنے گھر والوں سے فرماتے کہ پھل وغیرہ تو کھالو اور باقی چیزیں واپس کر دو (حوالہ سابق)۔

علامہ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں: ان آثار سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہدایا اور تحائف کے باب

میں تہوار سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور نہ اس سے غیر مسلموں کی اعانت لازم آتی ہے، اس لئے غیر حربی کافروں کا ہدیہ قبول کرنا جائز ہے، خواہ وہ تہوار کے موقعہ پر ہو یا کسی اور موقع پر (اقتضاء الصراط المستقیم ص ۱۲۰)۔

متاخرین میں مولانا تھانویؒ غیر مسلموں کے تہواروں کے موقعہ پر ہدیہ قبول کرنے کے جواز کے قائل ہیں، اور اس ہدیہ کو مہدی لہ کی تعظیم مانتے ہیں نہ کہ تہوار کی تعظیم (امداد الفتاوی ۳/ ۴۸۲)۔

البتہ علامہ عبدالحی فرنگی محلیؒ اس کے عدم جواز کے قائل ہیں، اور انہوں نے اپنے قول کے استدلال میں فقہ حنفی کی مشہور کتاب ''ذخیرۃ الفتاوی'' کی عبارت نقل کی ہے، چنانچہ تحریر فرماتے ہیں:

''لا ینبغی للمؤمن أن یقبل هدیة کافر فی یوم عید ولو قبل لا یعقبهم ولا یرسل إلیهم'' (مسلمانوں کے لئے مناسب نہیں کہ کافر کا ہدیہ تہوار کے موقع پر قبول کرے، اور اگر قبول کرے تو ان کو ہرگز کوئی تحفہ بدلہ میں نہ دے، اور نہ کسی کے ہاتھ بھیجے)۔

میری رائے مذکورہ بالا آثار واقوال کی روشنی میں یہ ہے کہ اگر غیر مسلم پڑوسی کا ہدیہ گوشت وغیرہ کی قبیل سے ہو جو وہ اپنے تہواروں کے موقعوں پر بتوں وغیرہ پر ذبح کرتے ہیں یا پرساد چڑھاتے ہیں اور یہ پوری طرح ثابت ہو کہ پرساد یا چڑھاوا ہے تو **''وما ذبح علی النصب''** (مائدہ:۳)، **''وما أهلّ لغیر الله به''** (بقرہ:۱۷۳) کے تحت ناجائز وحرام ہے، اور جس حد تک ممکن ہو اس کے لینے سے اجتناب کرنا چاہئے، اور اگر نا لینے سے تعلقات کی خرابی، اور دشمنی پیدا ہونے کا اندیشہ ہو تو ''الضرر یزال'' و ''دفعاللضرر'' لے کر ایسی جگہ پھینک دے جس پر پڑوسی کی نظر نہ پڑے، یا جانور کو کھلا دے یا کسی غیر مسلم کو بطور ہدیہ دے دے۔

لیکن اگر ایسا نہ ہو بلکہ تہوار کے موقعہ پر عام طور سے لوگ دوستوں اور پڑوسیوں کو کھلانے کے لئے یا تقسیم کرنے کے لئے تیار کرتے ہیں مثلاً پھل یا مٹھائی وغیرہ تو اس کے لینے

اور کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے، البتہ احتیاط اسی میں ہے کہ اگر تعلقات میں کوئی خرابی کا اندیشہ نہ ہوتو بچا جائے۔

مولانا اختر امام عادل صاحب تحریر فرماتے ہیں: اس طرح سابقہ تفصیلات سے حکم شرعی یہ منقح ہوکر سامنے آتا ہے کہ غیر مسلموں کے غیر مذہبی تحائف قبول کرنا شرح صدر، اور حالات کے مطابق جائز ہے، اور اگر حالات اجازت نہ دیں یا غیر مسلم کی نیت وعمل پر اطمینان نہ ہوتو قبول کرنا مناسب نہیں، اور مذہبی تحائف اگر بتوں پر چڑھائے ہوئے ہوں تو قبول کرنا جائز نہیں، اور اگر بتوں پر چڑھائے ہوئے نہ ہوں تو قبول کرنا جائز ہے (غیر مسلم ملکوں میں آباد مسلمانوں کے مسائل اور ان کا شرعی حل، ص ۱۱۴)۔

۵- اس کے راز کی حفاظت کرنا، دوسروں سے اس کا افشاء نہ کرنا۔

۶- پڑوسی اگر مصائب وآلام کا شکار ہوجائے تو اس کی دادرسی کرنا، اس کو تسلی دینا، اس کی پریشانی دور کرنے کی جس حد تک ممکن ہو کوشش کرنا۔

۷- نارمل حالات میں اس کے پاس جانا اور اس کی خیریت معلوم کرنا؛ تاکہ الفت و محبت میں اضافہ ہو، اور نفرت وکدورت کی دیواریں منہدم ہوں، اور معاشرہ امن وسکون کا گہوارہ بنے۔

۸- پڑوسی اگر بیمار ہوجائے تو اس کی عیادت کرنا، اور حسب ضرورت وحسب استطاعت اس کی مدد کرنا۔

۹- اگر کسی مشکل گھڑی میں آواز دے تو اس کی دعوت پر لبیک کہنا؛ تاکہ اس کو اپنی تنہائی اور کم مائیگی کا احساس نہ ہو۔

۱۰- اس کے حالات کا جائزہ لیتے رہنا، اور اگر کسی ضرورت کی وجہ سے گھر سے دور ہو تو اس کے بچوں کی خبر گیری کرنا، اور بقدر استطاعت اس کے بچوں کی ضروریات کی تکمیل کرنا۔

۱۱- پڑوسی کو اذیت دینے کی تمام شکلوں سے اجتناب کرنا خواہ قولاً ہو یا عملاً یا سبباً۔

۱۲-تمام مشکل حالات میں پڑوسی کا ساتھ دینا، اوراس کے مشکلات کے حل میں تگ ودو کرنا۔

۱۳-اگر پڑوسی قرض خواہ ہو، اور آپ اس کو قرض دینے کی استطاعت رکھتے ہوں تو قرض دینے میں کوئی دریغ نہ کریں۔

۱۴-پڑوسیوں کے مابین اگر مخاصمت ہوجائے تو ان کے مابین صلح وصفائی کی کوشش کرنا، اور جس حد تک ممکن ہو آپس میں الفت ومحبت قائم کرنے کی کوشش کرنا۔

۱۵-علم کی مجلس میں اس کو شریک کرنا، اور اگر وہ خود باصلاحیت ہو تو اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنا؛ تاکہ وہ دین سے مانوس ہو، ممکن ہے کہ آپ کے اس سلوک سے اس کو ہدایت کی توفیق مل جائے۔

۱۶-اور اگر کہیں علم کی مجلس سجی ہو تو اس کو ساتھ لے جانا؛ تاکہ وہ بھی علم کی دولت سے مالا مال ہو، اور ہوسکتا ہے کہ اس کے دل میں ایمان گھر کر جائے اور وہ بھی دولت ایمان سے سرفراز ہوجائے۔

۱۷-ہمیشہ اس کے بارے میں حسن ظن رکھنا اور بدگمانی سے بچنا تاکہ آپس میں الفت ومحبت قائم ہو اور نفرت کی دیواریں آپس میں حائل نہ ہوں۔

۱۸-اگر پڑوسی کی طرف سے کوئی اذیت پہنچے تو اس کو برداشت کرنا، اور جس حد تک ممکن ہو اس پر صبر کرنا؛ تاآنکہ اذیت ناقابل برداشت ہوجائے، تو اس کے حل کی جو شکلیں فرمان نبوی میں موجود ہیں ان کو اختیار کرنا۔

۱۹-پڑوسی کو خوش آمدید کہنا، اور اس کو سلام کرنے میں جلدی کرنا، البتہ اس سلسلہ میں صحابہ کرام اور فقہاء کے مابین قدرے اختلاف ہے جسے ہم تفصیلات کے ساتھ ذکر کررہے ہیں۔

اس میں بنیادی بات نص قرآنی ''**وإذا حييتم، بتحية فحيوا بأحسن منها أو**

ردّوها"(سورۂنساء:۸۶)۔

(جب تمہیں سلام کیا جائے تو اس سے بہتر طریقہ سے سلام کا جواب دو یا جیسا سلام کیا ہے ویسا ہی جواب دو)۔

یہاں مطلق طور پر یہ کہا گیا ہے کہ اگر کوئی تمہیں سلام کرے تو تم اس کا جواب اس سے اچھا دو یا کم از کم جیسا اس نے سلام کیا اتنا ہی دے دو، اس میں مسلم وغیر مسلم کی کوئی قید نہیں ہے، اسی بنیاد پر عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں: یہ حکم عام ہے، خواہ سلام کرنے والا مسلمان ہو یہودی ہو یا نصرانی ہو یا مجوسی، چنانچہ امام طبری نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول بسند صحیح یوں نقل کیا ہے:

"عن عكرمة عن ابن عباس قال: من سلم عليک من خلق الله فاردد عليه وإن كان مجوسيا فإن الله يقول:"وإذا حييتم بتحية فحيوا بأحسن منها أو ردّوها"(۸/۵۸۷)۔

(اللہ کی مخلوق میں سے جو تم کو سلام کرے اس کو جواب دو چاہے وہ مجوسی کیوں نہ ہو)۔

اس میں صرف مجوسی کا لفظ ہے، لیکن امام بخاریؒ نے "**الأدب المفرد مع فضل الله الصمد**" میں یوں ذکر کیا ہے: "**ردّوا السلام على من كان يهوديا أو نصرانيا أو مجوسيا**"(۲/۵۳۳)(سلام کا جواب دو چاہے سلام کرنے والا یہودی ہو یا نصرانی یا مجوسی)۔

اس روایت میں اگرچہ ایک راوی ولید بن عبداللہ بن ثور ہیں جن پر بعض محدثین نے کلام کیا ہے۔

لیکن اکثر محدثین فقہاء نے اس میں مسلم وغیر مسلم کا فرق کیا ہے، اور یہ کہا ہے کہ "بأحسن منہا" کا تعلق مسلمانوں سے ہے، اور "ردوہا" کا تعلق غیر مسلموں سے ہے، اس کے قائل قتادہ، عطاء اور ابن زید وغیرہم ہیں، اور ان کا مستدل انس بن مالک کی روایت ہے جس میں آپ ﷺ فرمارہے ہیں کہ اگر اہل کتاب تم سے سلام کریں تو تم وعلیکم کہو۔

"عن انس بن مالکؓ قال: قال النبی ﷺ: إذا سلّم علیکم أهل الکتاب فقولوا: وعلیکم" (بخاری، کتاب الاستئذان، باب کیف الرد السلام علی اہل الذمہ، حدیث نمبر: ۶۲۵۷)۔

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: **"دلّ الحدیث علی التفرقة فی الرد علی المسلم والکافر"** (فتح الباری ۱۱/ ۴۴)۔

(حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ حدیث اس بات پر دال ہے کہ سلام کے جواب میں کافر اور مسلم کے درمیان فرق کیا جائے گا)۔

علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں: ذمیوں کے سلام کا جواب دینے نہ دینے کے مسئلہ میں اختلاف ہے، جس طرح مسلمان کے سلام کا جواب دینا واجب ہے کیا اسی طرح ذمیوں کے سلام کا جواب دینا بھی واجب ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، امام شعبی، قتادہ وغیرہ سورہ نساء کی آیت سے تمسک کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ذمیوں کے سلام کا جواب دینا بھی واجب ہے، لیکن امام مالکؒ، جیسا کہ اشہب اور ابن وہب نے ان سے نقل کیا ہے، فرماتے ہیں کہ یہ واجب نہیں ہے، اگر جواب دیا جائے تو صرف ''علیک'' کہا جائے (الجامع لأحکام القرآن ۵/ ۳۰۵، ۱۷/ ۲۹۳)۔

امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ مشرک کو سلام نہیں کیا جائے گا، البتہ سلام کا جواب دیا جائے گا، امام محمدؒ کے بقول یہی ہمارے عام فقہاء کا قول ہے (احکام القرآن جصاص ۳/ ۵۲۵)۔

امام نووی فرماتے ہیں: شوافع کا مسلک یہ ہے کہ غیر مسلموں کو سلام کرنے میں پیش قدمی کرنا حرام ہے، لیکن جواب دینا واجب ہے؛ البتہ جواب میں 'وعلیکم یا علیکم' کہا جائے گا، اس سے زیادہ نہیں، یہی اکثر علماء اور عام سلف کی رائے ہے (شرح السنۃ للإمام البغوی ۵/ ۱۴ (ص ۱۴۵)

(ماخوذ از غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق: مولانا سید جلال الدین عمریؒ)۔

مذکورہ بالا تفصیلات سے اتنی بات تو واضح ہوگئی کہ علماء کے مابین اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ غیر مسلموں کے سلام کا جواب دیا جائے گا، البتہ اس کا ضرور لحاظ کیا جائے گا کہ اس

کے حدود کیا ہوں اور اس کے لئے کن الفاظ کا استعمال کیا جائے، اور جب مطلق طور پر غیر مسلم کے سلام کا جواب دینا ضروری ہے تو اگر غیر مسلم پڑوسی ہو تو اس کے سلام کا جواب دینا حق جوار کا لحاظ کرتے ہوئے بدرجہ اولی بہتر ہے، اور پھر یہ مسائل ان ملکوں کے ہیں جہاں غیر مسلم اقلیت میں ہوں، لیکن وہ ممالک جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، وہاں جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کے پیش نظر، اور سماجی تعلقات کو نباہتے ہوئے سلام کا جواب دینا وجوب کے درجہ میں ہوگا، جیسا کہ بعض فقہاء سے منقول ہے۔

اوپر جو باتیں ذکر کی گئی ہیں وہ غیر مسلم کے سلام کا جواب دینے سے متعلق تھیں، اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ غیر مسلم کو سلام کرنا کیسا ہے اور کیا ان کو سلام میں پہل کرنا درست ہوگا؟

اتنی بات تو سبھی جانتے ہیں کہ مسلمانوں کے درمیان سلام کو عام کرنے اور اس کو رواج دینے کا حکم ہے، اور سلام کو ایک دوسرے سے الفت و محبت کو قائم کرنے کا ذریعہ، اور جنت میں دخول کا سبب قرار دیا ہے، چنانچہ مسلم کی روایت ہے: ''**لاتدخلوا الجنة حتى تؤمنوا ولا تؤمنواحتى تحابوا، أو لا أدلكم على شئ إذا فعلتموه تحاببتم، أفشواالسلام بينكم**'' (کتاب الایمان، باب بیان أنہ لا یدخل الجنۃ إلا المؤمنون؛ ابوداؤد، کتاب السلام، باب إفشاء السلام، ترمذی، ابواب الاستیذان، باب ماجاء فی إفشاء السلام)۔

(تم جنت میں داخل نہیں ہوگے؛ تا آنکہ ایمان نہ لاؤ، اور ایمان کامل نہ لاؤ گے جب تک کہ آپس میں محبت نہ کرو، کیا میں تمہیں ایسی چیز نہ بتاؤں کہ اس پر عمل کرو تو ایک دوسرے سے محبت کرنے لگو، وہ یہ ہے کہ اپنے درمیان سلام کو عام کرو)۔

اس حدیث میں لفظ '' **بینکم** ''اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ مسلمانوں کو آپس میں سلام کو عام کرنا چاہئے؛ کیونکہ یہ تعلقات کو مضبوط کرتا ہے، اور آپس میں الفت و محبت کو قائم کرتا ہے، لہذا تمام مسلمانوں کو سلام میں پہل کرنا چاہئے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہی حکم غیر مسلموں کے سلسلے میں بھی ہے بالخصوص غیر مسلم پڑوسیوں کے بارے میں، اس کا

جواب یہ ہے کہ اس باب میں حالات ومصالح کے لحاظ سے معاملہ کیا جائے گا، جن حدیثوں میں غیر مسلموں کو سلام نہ کرنے کا حکم ہے، اس کا پس منظر کچھ اور ہے، مثال کے طور پر ہم یہاں دو حدیث ذکر کر رہے ہیں جن میں صراحت کے ساتھ اللہ کے رسول ﷺ فرمارہے ہیں کہ یہود و نصاری کو سلام میں پہل نہ کرو۔

"**عن أبی هريرةؓ أن رسول الله ﷺ قال: لا تبدء واالیهود ولا النصاری بالسلام، وإذا لقيتم أحدهم فی طريق فاضطروه إلی أضيقه**"(مسلم، کتاب السلام، باب النہی عن أہل الکتاب بالسلام، سنن الترمذی، ابواب الإستئذان، باب ما جاء فی کراہیۃ التسلیم علی الذمی، ابوداؤد، کتاب السلام، باب فی السلام علی اہل الذمۃ، مسند احمد ۱۹/ ۴۷، حدیث نمبر: ۹۹۲۱، ایک دوسری روایت میں یہود کی جگہ مشرکین آیا ہے، حدیث نمبر: ۹۷۲۴)۔

(یہود ونصاری کو سلام کا آغاز تمہاری طرف سے نہ ہو، ان میں سے کسی سے راستہ میں ملاقات ہو جائے تو اسے اس کے تنگ حصہ میں چلنے پر مجبور کرو)۔

یہاں یہ بات واضح رہے کہ: "**فاضطروهم إلی أضيقه**" کا مطلب یہ ہے کہ اگر راستہ تنگ ہو تو تم احتراماً ان کو راستہ مت دے دو بلکہ ان کو اسی تنگ راستہ سے گزرنے پر مجبور کرو، لیکن اگر راستہ کشادہ ہو تو ان کے ساتھ چلنے میں کوئی حرج نہیں ہے؛ کیونکہ ایسی صورت میں بلاوجہ کسی کو اذیت دینا ہوگا جو ہماری شریعت میں قطعی طور پر ممنوع ہے (فتح الباری ۱۱/ ۴۲ نقلا عن القرطبی)۔

دوسری روایت: "**عن أبی عبد الرحمن الجهنی أنه قال: قال رسول الله ﷺ :إنی راکب غدا إلی اليهود فلا تبدء وهم بالسلام فإذا سلموا عليكم فقولوا وعليكم**" (الأدب المفرد للبخاری، کتاب الأدب علی اہل الذمۃ فی رد السلام، اور ابونضرہ الغفاری کی روایت میں: "إنا غادون إلی يهود" ہے)۔

(میں کل یہود کی طرف جانے والا ہوں، لہذا تم لوگ ان سے سلام میں پہل مت کرنا، اور اگر وہ تم کو سلام کریں تو تم ان سے صرف وعلیکم کہنا)۔

ان دونوں روایتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے صحابہ کرام کو غیر مسلموں کے سلام میں آغاز سے منع فرمایا ہے، جبکہ صحابہ میں سے بہت سے ایسے ہیں جن کا معمول یہ تھا کہ راستہ چلتے ہوئے جس سے ان کی ملاقات ہوتی تو وہ ان کو سلام میں پہل کرتے تھے، ان میں عبد اللہ بن مسعودؓ، ابودرداءؓ، اور ابو امامہؓ، فضالہ بن عبید ہیں، چنانچہ امام بیہقی نے حضرت ابوامامہؓ کے عمل کو نقل کیا ہے جس میں ہے کہ راستہ میں جس کسی سے ان کی ملاقات ہوتی ان کو سلام کرتے خواہ وہ مسلم ہو، نصرانی ہو یا یہودی، چھوٹا ہو یا بڑا، جب ان سے اس سلسلے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا: ہمیں سلام کو عام کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

"فأخرج البيهقى عن أبى امامة أنه كان لا يمرّ بمسلم ولا نصراني ولا صغير ولا كبير إلا سلم عليه، فقيل له: فقال إنا أمرنا بإفشاء السلام وقال: سمعت رسول الله ﷺ يقول: إن الله عزوجل جعل السلام تحية لأمتنا وأمانا لأهل ذمتنا" (منقول از فتح الباری ۱۱/ ۴۲)۔

(امام بیہقی نے ابوامامہؓ سے روایت نقل کیا ہے کہ وہ جب بھی راستہ میں کسی مسلمان یا نصرانی یا چھوٹے یا بڑے کے پاس سے گزرتے تو ان کو سلام کرتے، جب ان سے سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ ہمیں سلام کو عام کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اور میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ سلام ہماری امت کے لئے برکت کی دعا ہے اور ذمیوں کے لئے امن وامان کا اظہار ہے)۔

اسی طرح دوسری روایت عبداللہ بن مسعودؓ کی ہے جس کو امام طبری نے بسند صحیح عن علقمہ نقل کیا ہے، کہتے ہیں: **"كنت دفا لابن مسعود، فصحبنا دهقان، فلما انشعبت له الطريق أخذ فيها، فأتبعه عبد الله بصره، فقال: السلام عليكم، فقلت: ألست تكره أن يبدوا بالسلام؟ قال: نعم، ولكن حق الصحبة"** (فتح الباری ۱/ ۴۴)۔

(حضرت علقمہ کہتے ہیں: ہم لوگ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے ساتھ ایک سفر میں

تھے،بعض دہقان (ذمی) بھی شریک سفر تھے، کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد ان کا راستہ الگ ہو گیا، اور وہ اس پر چلنے لگے، تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے انہیں سلام کیا، میں نے عرض کیا کہ کیا ذمیوں کو سلام کرنا ناپسندیدہ نہیں ہے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے جواب دیا کہ یہ تو حق صحبت ہے)۔

اسی طرح کی روایت عون بن عبداللہ سے محمد بن کعب القرظی نے نقل کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے محمد بن کعب القرظی سے پوچھا کہ آپ کی کیا رائے ہے کہ کیا ذمی کو سلام میں ابتداء کرنی چاہئے تو انہوں نے کہا: "**ماأری بأسا أن نبدأهم، قلت:لما؟قال: لقوله تعالی "فاصفح عنهم وقل سلام**"۔

(میں انہیں آگے بڑھ کر سلام کرنے میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتا، میں نے کہا: کیوں؟ تو انہوں نے قرآن کی یہ آیت تلاوت کی" کہ آپ ان سے درگذر کیجئے اور انہیں سلام کہئے)۔

اگر چہ اس آیت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ آیت: "**قاتلوا المشرکین**" سے منسوخ ہے لیکن اس کی منسوخیت کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

ان تمام روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ وتابعین میں سے بہت سے اس بات کے قائل تھے کہ غیر مسلم کو سلام کرنا جائز ہے، اور اگر مصالح ہوں یا سماجی مجبوریاں ہوں تو بدرجہ اولی جائز ہے مثلاً حق صحبت یا حق مجاورت یا حق مکافات وغیرہ۔

سلام میں پہل سے ممانعت کی وجہ:

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ کی طرف سے سلام میں پہل کی ممانعت کی وجہ کیا ہے؟ اور جن کا عمل اس کے خلاف ہے تو اس کا جواب سید جلال الدین عمری صاحب نے یوں دیا ہے:" رسول اللہ ﷺ کے مدینہ منورہ پہنچنے کے فوراً بعد یہود کے ساتھ امن وامان، مذہبی

آزادی، اور باہمی تعاون کا معاہدہ ہوا، لیکن انہوں نے کبھی اس کی پاسداری نہ کی، اسلام دشمنی، سازشیں اور خیانتیں روز بروز بڑھتی ہی چلی جارہی تھیں، سلام وکلام میں ان کے غیر شریفانہ رویہ اور حرکتوں کے باوجود قرآن نے ان سے درگذر کا حکم دیا (بقرہ:۱۰۹)۔

جب یہ سازشیں آخری حد کو پہنچ گئیں، تو ان سے جنگ بھی ہوئی، اور انہیں جلاوطن بھی کیا گیا (حشر:۱-۵)۔

اس طرح حالات کے لحاظ سے ان کے سلسلہ میں اسلام کے رویہ میں تبدیلی آتی رہی ہے، ہوسکتا ہے کہ سلام میں پیش قدمی نہ کرنے اور راستہ میں ان کا احترام نہ کرنے کی ہدایت اسی طرح کے حالات میں دی گئی ہو، ظاہر ہے حالات کے بدل جانے کے بعد حکم بھی بدل جائے گا، اس کی تائید بعض صحابہ و تابعین کے عمل سے ہوتی ہے (غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق رص ۱۱۸)۔

غیر مسلم کو سلام میں پہل کرنے کی وجوہات:

یہاں یہ بات گوش گذار کردینا مناسب سمجھتا ہوں کہ فقہاء نے جن وجوہات کی وجہ سے غیر مسلم کو سلام کرنے کی اجازت دی ہے ان میں سب سے بڑی وجہ حق جوار ہے، فقہاء احناف کے یہاں تو اس حد تک اجازت ہے کہ اگر غیر مسلم پڑوسی کو اس کا احساس ہو کہ سفر سے واپسی پر اس سے مصافحہ نہ کیا تو اس کو تکلیف ہوگی تو اس کی دل آزاری سے بچنے کے لئے اس سے مصافحہ بھی جائز ہے۔

"**لا بأس بمصافحة المسلم جاره النصرانی إذا رجع بعد الغيبة ويتأذى بترک المصافحة**" (ردالمحتار علی الدرالمختار ۹ ئ ۵۹۰ کتاب الحظر والإباحۃ)۔

اور جب مصافحہ کرنا جائز ہے تو سلام کرنا بدرجہ اولی اس میں شامل ہوگا، اور پھر پڑوسی کی اسلام میں جو اہمیت ہے اس کا مفصل جائزہ ہم پہلے پیش کرچکے ہیں۔

۲-ضرورت،ضرورت خواہ سماجی ہو یا معاشرتی،معاشی ہو یا تجارتی،طبی ہو یا علمی،ان تمام وجوہات کی بنیاد پر غیر مسلم کو سلام کرنا جائز ہے۔

سلیمان بن الأعمش کہتے ہیں: میں نے حضرت ابراہیم نخعی سے کہا کہ ایک نصرانی طبیب کے یہاں میری آمدورفت رہتی ہے،کیا میں اسے سلام کرسکتا ہوں؟ آپ نے جواب دیا کہ جب تمہاری اس سے کوئی حاجت ہوتو سلام کرو۔

"حدثنا سليمان الأعمش قال: قلت لإبراهيم:أختلف إلى طبيب نصرانى، أسلم عليه؟ قال نعم:إذا كانت لک إليه حاجة فسلم عليه"(۴۲۷/۳ دارالفکر)۔

علامہ قرطبی نے امام نخعی کے قول کو اس طرح نقل کیا ہے:"**إذا كانت لک حاجة عند يهودى أو نصرانى فابدأه بالسلام، فبان بهذا أن حديث أبى هريرة إذا كان لغير سبب يدعوكم إلى أن تبدؤهم بالسلام من قضاء زمام أوحاجة تعرض لكم قبلهم أو حق صحبة أو جوار أوسفر**"(۹۵/۱۱)۔

(اگر تمہیں کسی یہودی ونصرانی سے کوئی ضرورت درپیش آئے تو اس سے ملاقات کا آغاز سلام سے کرو،اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ابوہریرہؓ کی حدیث (غیر مسلموں کو سلام سے ممانعت والی) اس صورت میں ہے جب ان سے کوئی حاجت متعلق نہ ہو،مثلاً کسی حق کی ادائیگی یا کوئی حاجت جو تمہیں ان سے پیش آئے مثلاً حق مصاحبت،یا ہمسائیگی،یا سفر میں ساتھ ہو)۔

۳-تالیف قلب کے لئے سلام:اگر اس کا احساس ہو کہ آپ کا غیر مسلم پڑوسی آپ کے سلام کرنے سے اسلام کی طرف راغب ہوگا،یا کم از کم اسلام کے تئیں اس کے سوچنے کا زاویہ بدل جائے گا،اور اسلام کے تئیں اس کے دل میں رغبت پیدا ہوگی تو اس کو سلام کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

"لمصلحة التأليف أى تأليف قلوب الناس واستمالتهم باللسان والإحسان إلى الدخول فى الإسلام" (ردالمحتار علی الدر المختار ۹/۵۹۱، کتاب الحظر والإباحۃ باب الإستبراء وغیرہ، دارالکتب العلمیہ بیروت)۔

اگرچہ اس سلسلے میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ تالیف قلب کے لئے سلام کرنے والی بات ابتداء اسلام میں تھی، پھر جب اسلام اور مسلمانوں کو غلبہ واقتدار حاصل ہوگیا تو اس کی ضرورت جاتی رہی (فتح الباری ۱/۵۶، عمدۃ القاری ۱/۱۵۷)۔

لیکن یہ بات متحقق نہیں ہے کہ افشاء سلام کا حکم پہلے تھا اور بعد میں استعلاء اسلام کے بعد اس کی ممانعت ہوگئی، جبکہ تالیف قلب کا مقصد ہی غیر مسلموں کے قلوب کو اپنی زبان وحسن سلوک سے اسلام کی طرف مائل کرنا ہے، اور اسلام نے جن اعلی اخلاقیات کی تعلیم دی ہے، سلام اسی کا ایک حصہ ہے، ہمیں اسی پہلو پر غور کرنا چاہئے بالخصوص ہندوستان جہاں نفرت وعداوت کی آندھی چل رہی ہے، مسلمانوں کے تئیں بغض وحسد، ظلم وجبر کی تیز وتند ہوائیں روز افزوں ہوں، جہاں پڑوسی پڑوسی کی گردن کاٹنے، عزت وآبرو کے ساتھ کھلواڑ کرنے، مال ودولت کو تباہ وبرباد کرنے کے ہر وقت درپے ہو، ایسے وقت میں مقاصد شریعت حفظ جان، حفظ عرض، وحفظ مال کے پیش نظر سلام کرنا نہ صرف اولی وافضل ہے بلکہ حاجیات وضروریات میں شامل ہے، اور ضروریات کی وجہ سے جب مسلم ممالک میں غیر مسلم کو سلام میں پہل کرنا جائز ہے، جیسا کہ اوپر اقوال صحابہ وعمل صحابہ وتابعین وفقہاء عظام ذکر کرچکے ہیں، تو وہ ممالک جہاں مسلمان اقلیت میں رہتے ہیں وہاں غیر مسلم پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کرنا، بلند اخلاقی کا مظاہرہ کرنا جس میں سلام سب سے بہتر مظاہرہ ہے، کس درجہ ضروری ہے وہ کسی بھی ذی ہوش سے مخفی نہیں ہے۔

علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں: **"لوأن المسلم بدار حرب أو دار كفر غير حرب لم يكن مأمورا بالمخالفة لهم فى الهدى الظاهر، لما عليه فى ذلك من الضرر، بل قد يستحب للرجل أو يجب عليه أن يشاركهم أحيانا فى هديهم**

الظاهر، إذا كان ذلک مصلحة دينية من دعوتهم إلى الدين والاطلاع على باطن أمورهم لإخبار المسلمين بذلک أو دفع ضررهم عن المسلمين ونحوذلک من المقاصد الصالحة"(اقتضاءالصراط المستقیم ۱/۴۱۸)۔

(اگر مسلمان دارالحرب یا دارالکفر غیر حرب میں رہتا ہو، تو اس کو مشرکین کے ظاہری طور طریقوں میں مخالفت کرنے کا حکم نہیں ہے؛ کیونکہ اس میں اس کو ضرر لاحق ہونے کا اندیشہ ہے، بلکہ مسلمان کے لئے مستحب یا واجب ہے کہ کبھی کبھی ان کے ظاہری طور طریقوں میں شریک ہو اگر یہ عمل کسی دینی مصلحت کی خاطر ہو، مثلاً دین کی دعوت دینا یا غیر مسلموں کی خبروں سے باخبر ہو کر مسلمانوں کو بتانا ہو یا مسلمانوں سے ضرر کو دور کرنا ہو اور اس جیسے اچھے مقاصد ہوں۔

اس سے بھی واضح ہوتا ہے کہ اگر مسلمان ایسی جگہ رہتے ہوں جہاں کفار کا غلبہ ہو، اور حالات اس بات کے متقاضی ہوں کہ اگر مشرکوں کے ظاہری طور طریقوں میں شریک نہ ہوگا تو ضرر شدید کا شکار ہو جائے گا، تو بہتر یہ ہے کہ نا چاہتے ہوئے بھی شریک ہو، یا کم از کم ان کی مخالفت سے احتراز کرے، جلب منفعت کے لئے نہیں بلکہ دفع ضرر اور اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے، اور ظاہری طور پر ان کا اکرام واحترام کرے، اور کسی بھی انسان کا اعزاز واکرام سلام سے بہتر کوئی نہیں ہے، اس لئے میری رائے میں جہاں بھی مسلمان ایسے حالات سے دوچار ہوں، ان کا سلام میں پہل کرنا بہتر ہے۔

آخری بات:

ہم نے اوپر جو کچھ آیات قرآنیہ واحادیث نبویہ، اقوال صحابہ اور عمل سلف میں سے ذکر کیا ہے ان سے جو چیز واضح ہوتی ہے وہ یہ کہ اسلام اپنے ماننے والوں سے جہاں یہ چاہتا ہے کہ عقائد واعمال میں، عادات واطوار میں مکمل طور پر اسلامی ہو، اور جہاں بھی رہیں اسلامی تشخصات کے ساتھ رہیں، اور اگر اسلامی ریاست ہو تو اپنی چال ڈھال، اور طور وطریق سے ایسا اظہار ہو کہ اغیار یہ سمجھنے پر مجبور ہوں کہ انہیں کفر وشرک، اور غیر اسلامی اخلاق وعادات سے حد درجہ نفرت

ہے، "**لاتبدء وا الیھود ولاالنصاری بالسلام، وإذا لقیتم أحدھم فی طریق اضطروہ إلی أضیقہ**"(مسلم وترمذی)؛ تاکہ غیر مسلموں کو اس کا احساس ہو کہ ان کے ساتھ جو کچھ سلوک ہو رہا ہے وہ دامن اسلام سے وابستہ نہ ہونے کے نتیجہ میں ہو رہا ہے، اور پھر اپنے آپ کو اسلام کی ضیابار کرنوں سے منور کرلیں، اور اگر وہ غیر اسلامی ریاست میں ہو تو اس کے حسن اخلاق وحسن کردار سے ایسا اظہار ہو کہ اغیار یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جن کو اختیار کر کے دنیا وآخرت میں کامیابی سے ہم کنار ہوسکتا ہے، چوری، زنا کاری، قمار بازی وشراب نوشی سے مکمل اجتناب ہو، بداخلاقی وبدکرداری کا کوئی داغ دھبہ اپنے دامن پر نہ لگنے دے، جہاں رہتا ہو، جس ملک میں رہتا ہو، جن لوگوں کے ساتھ رہتا ہو بالخصوص پڑوسیوں کے ساتھ آپ کی طرف سے ایسا اظہار ہو کہ آپ دین کے داعی، حق کے علمبردار، اور صلح وآشتی کے پیامبر اور انسانیت کے مسیحا ہیں، سلام جو خالص اسلامی دعا ہے جو کسی غیر مسلم کو نہیں کیا جاسکتا لیکن اگر آپ کی اس سے ضرورت ہو یا سماجی اعتبار سے تعلقات کے بگڑنے کا اندیشہ ہو تو تعلقات کو نباہتے ہوئے اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

"**قال سلیمان الأعمش: قلت لابراھیم النخعی:أختلف إلی طبیب نصرانی أسلم علیہ؟ قال: نعم، إذا کانت لک إلیہ حاجۃ فسلم علیہ** "(احکام القرآن للجصاص ۳/۲۶)۔

ہدایا وتحائف کا تبادلہ مسلمانوں کے مابین الفت ومحبت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، اور حضور ﷺ نے اپنی امت کو اس کی بڑی تاکید کی ہے، البتہ غیر مسلموں کے تحائف قبول کرنے نہ کرنے کے بارے میں دونوں روایتیں ہیں، لیکن راجح قول قبول کرنے کے ہیں، اس میں بھی اگر پڑوس کا معاملہ ہو، نہ لینے دینے میں تعلقات متاثر ہونے کا اندیشہ ہو تو قبول کرنا اور دینا ہی بہتر ہے؛ البتہ اس میں اس کا ضرور خیال کیا جائے گا کہ وہ بتوں پر ذبح کئے ہوئے یا چڑھاوے کے نہ ہوں، مشہور اصول ہے: "**الضرر یزال**"۔

الغرض مسلمان جہاں رہیں جس ماحول میں رہیں حالات کے اعتبار سے جزئی مسائل میں تبدیلی کر سکتے ہیں؛ تاکہ معاشرہ کے اندر امن وسکون کی فضاء قائم ہو، اور قوموں کے مابین مسلمان اپنی افادیت واہلیت ثابت کرسکیں، نہ کہ ان سے الگ تھلک رہ کر عجوبہ بن جائیں، یہی مرضی مولی وخالق ارض وسما ہے۔

☆☆☆

تکثیری معاشرہ کے لئے قرآنی ہدایات

ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی، نئی دہلی

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسانوں کے درمیان گوناگوں اختلافات پائے جاتے ہیں، رنگ، نسل، زبان، علاقہ، تہذیب وتمدن، معاشرت، عقیدہ، مذہب، کسی معاملے میں وہ یکساں نہیں ہیں، بلکہ ان سب پہلوؤں سے ان میں نمایاں فرق پایا جاتا ہے، ان اختلافات کو نظر انداز کرنے، انہیں گوارا کرنے اور ان کے باوجود مل جل کر رہنے اور پر امن طریقے سے زندگی گزارنے کو موجودہ دور کی ایک اہم قدر قرار دیا جارہا ہے، اس کے لئے ایک اصطلاح (PLURALISM) کی وضع کی گئی ہے، اردو میں اس کا ترجمہ 'کثرتیت' یا 'تکثیریت' کیا جاتا ہے۔

ریفرینس آکسفورڈ ڈکشنری میں PLURALISM کا یہ مفہوم بیان کیا گیا ہے:

The existence or toleration in society of a number of groups that belong to different races or have different political or religious beliefs.

''تکثیریت سے مراد ہے کسی سماج میں ایسے متعدد گروہوں کی موجودگی اور ان کے درمیان رواداری جو مختلف نسلوں سے تعلق رکھتے ہوں یا مختلف سیاسی تصورات یا مذہبی عقائد کے حامل ہوں''۔

برٹانیکا ریفرنس انسائیکلوپیڈیا میں اس کی تشریح کی گئی ہے:

Pluralism assumes that diversity is beneficial to society and that the disparate functional or cultural groups of which society is composed-including religious, trade unions, professional organisations and ethnic minorities-should be autonomous"

''تکثیریت کا مفروضہ یہ ہے کہ تنوع سماج کے لئے مفید ہے، چنانچہ سماج کے مختلف طبقات یا تہذیبی اکائیوں کو-جن میں مذہبی گروہ، ٹریڈ یونینس، پیشہ ورانہ انجمنیں اور نسلی اقلیتیں شامل ہیں-حق خود اختیاری حاصل ہونا چاہئے''۔

قرآن کریم پر اعتراضات کی حقیقت:

قرآن کریم پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں ان میں سے ایک بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ علاحدگی پسند ہے، وہ اپنے ماننے والوں کو انفرادیت پسندی سکھاتا ہے، اور انہیں دوسرے مذاہب کے ماننے والوں سے الگ تھلگ رکھنا چاہتا ہے۔ حسن سلوک، ہمدردی، مساوات، ربط باہم، تعاون و امداد اور خوش گوار انسانی تعلقات کے سلسلے میں اس نے جو تعلیمات و ہدایات دی ہیں، وہ صرف مسلمانوں کے لئے ہیں، رہے دوسرے مذاہب کے ماننے والے تو ان کے لئے اس کے پاس نفرت وحقارت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ وہ مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ کسی طرح کا تعلق نہ رکھیں۔ ان کے ساتھ کسی طرح کی ہمدردی وخیر خواہی نہ کریں، بلکہ انہیں تنگ کرنے، نیچا دکھانے اور تکلیف پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیں، اس طرح یہ تاثر دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ تکثیری معاشرہ کے لئے اسلام موزوں نہیں ہے۔ آج جبکہ پوری دنیا سمٹ کر ایک گاؤں بن گئی ہے، مختلف قوموں، گروہوں اور مذاہب سے تعلق رکھنے والوں کے درمیان تعامل ناگزیر ہے، ایسے میں قرآن کی معاشرتی تعلیمات فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔

یہی نہیں، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ دعوی بھی کیا جاتا ہے کہ قرآن کی بعض آیتوں میں مسلمانوں کو دوسرے دھرموں کے پیروکاروں سے لڑنے جھگڑنے اور جنگ وجدال کرنے کا حکم دیا گیا ہے، چنانچہ جب تک ان آیتوں کو قرآن سے نکالا نہیں جاتا، دیش کے دنگوں کو روکا نہیں جاسکتا۔ انہیں الزامات کے تحت کچھ عرصہ قبل کلکتہ ہائی کورٹ میں ایک مقدمہ دائر کیا گیا تھا اور قرآن پر پابندی عائد کروانے کی کوشش کی گئی تھی، مگر فاضل ججوں نے دانشمندی کا ثبوت دیتے

ہوئے اسے خارج کر دیا۔

قرآنی تعلیمات کے بارے میں یہ تاثر درست نہیں ہے، یہ صحیح ہے کہ قرآن نے اصولی طور پر مسلم اور کافر کے درمیان فرق کیا ہے، لیکن اس فرق کا کچھ بھی اثر انسانی حقوق اور معاشرتی تعلقات پر نہیں پڑتا۔ اس نے انسان کے جو بنیادی حقوق متعین کئے ہیں، ان سے ہر شخص بہرہ ور ہوگا، خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم۔ مثالی معاشرہ کی تشکیل کے لئے اسلام نے جو ہدایات اور تعلیمات دی ہیں، ان کا اطلاق معاشرہ کے تمام افراد پر ہوگا، خواہ وہ مسلم ہو یا کافر۔ ایک ایسا معاشرہ، جس میں مختلف مذاہب کے ماننے والے رہتے بستے ہوں، اس کے افراد کے باہمی تعلقات کے سلسلے میں قرآن نے واضح ہدایات اور احکام دیئے ہیں، ان کی روشنی میں یہ تعلقات بغض وعداوت، نفرت وحقارت، کشیدگی اور بدگمانی پر مبنی نہیں ہوں گے، بلکہ ان کی بنیاد حسن سلوک، ہمدری، تعاون باہمی، نصح وخیر خواہی اور حسن ظن پر قائم ہوگی۔

والدین اور رشتہ داروں سے تعلقات:

معاشرہ میں انسان کا سب سے قریبی تعلق والدین اور رشتہ داروں سے ہوتا ہے۔ قرآن ان کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیتا ہے اور اس معاملے میں مسلم اور کافر کی کوئی تفریق نہیں کرتا۔ اگر کسی شخص نے اسلام کو دین حق سمجھ کر قبول کیا ہو، لیکن اس کے والدین اس سعادت سے محروم ہوں، تو بھی مذاہب کا یہ اختلاف اسے ان کی خدمت کرنے، ان کی خبر رکھنے اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے سے باز نہیں رکھتا۔ یہی نہیں، بلکہ اگر اس کے والدین اس کے اسلام قبول کرنے کے نتیجے میں اس سے ناراض ہوجائیں، اس پر طرح طرح سے دباؤ ڈالیں کہ وہ اسلام سے پھر جائے اور اسے اذیتیں دیں، تو ایسی صورت میں یہ عمومی ہدایت ہے کہ وہ دین حق سے دست بردار تو نہ ہو، البتہ ردعمل کے طور پر طیش میں آ کر اپنے والدین کی خدمت اور ان کے ساتھ حسن سلوک ترک نہ کردے، بلکہ اس معاملے میں ادنی سی بھی کوتاہی نہ کرے، چنانچہ قرآن کا واضح حکم ہے:

"وإن جاهداک علی أن تشرک بی مالیس لک به علم فلا تطعهما وصاحبهما فی الدنیا معروفا" (لقمان:۱۵) (اور اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ میرے ساتھ تو کسی ایسے کو شریک کرے جسے تو نہیں جانتا تو ان کی بات ہرگز نہ مان؛ البتہ دنیا میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرتا رہ)۔

یہ آیت مکی دور کے اس زمانے میں نازل ہوئی تھی جب حضور ﷺ کی دعوت پر قریش کے نوجوان لبیک کہہ رہے تھے اور حلقہ بہ گوش اسلام ہو رہے تھے۔ دوسری طرف ان کے والدین، رشتہ دار اور خاندان کے لوگ انہیں اس سے روکنے اور اسلام سے پھیر کر آبائی مذہب کی طرف واپس لانے کے لئے ہر جتن کر رہے تھے اور اس میں ناکامی کی صورت میں انہیں جسمانی اذیتیں دے رہے تھے۔ ممکن تھا کہ ان حالات میں وہ نوجوان بھی ردعمل کی کیفیت کا شکار ہوجاتے اور والدین اور رشتہ داروں کے خلاف ان میں انتقامی جذبہ پیدا ہوجاتا، یا کم از کم ان سے وہ بے پروا ہوجاتے، لیکن انہیں تاکید کی گئی کہ وہ ناحق میں تو ان کی بات نہ مانیں، لیکن دنیاوی معاملات میں ان کے ساتھ بھلے طریقے سے پیش آئیں اور اچھا سلوک کرتے رہیں۔

والدین کے بعد رشتہ داروں کا درجہ ہے۔ وہ بھی اسی طرح حسن سلوک کے مستحق ہیں، قرآن تاکید کرتا ہے کہ رشتہ دار خواہ ہم مذہب ہوں یا دوسرے مذہب کے ماننے والے، ان کے حقوق ادا کئے جائیں اور ان کی خبر گیری میں کوتاہی نہ کی جائے۔ اس معاملہ میں قرآن کتنا حساس ہے، اس کا اندازہ ایک مثال سے بہ خوبی کیا جاسکتا ہے۔ اسلامی شریعت میں کسی شخص کے مستحق میراث ہونے کے لئے مسلمان ہونے کی شرط لگائی گئی ہے۔ کوئی کافر کسی مسلمان کا وارث نہیں ہوسکتا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کسی دوسرے ذریعہ سے بھی اسے کسی طرح کا مالی فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا۔ قرآن نے اجازت دی ہے کہ غیر مسلم رشتہ داروں کو وصیت یا تحفے تحائف کے ذریعے اپنے مال کا کچھ حصہ دیا جاسکتا ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"واولوالأرحام بعضهم أولی ببعض فی کتاب الله من المؤمنین

والمهاجرين إلا أن تفعلوا إلى أولیائکم معروفا" (احزاب:٦)(کتاب اللہ کی رو سے عام مومنین ومہاجرین کی بہ نسبت رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں، اس لئے اپنے اولیاء (دیگر متعلقین) کے ساتھ تم کوئی بھلائی (کرنا چاہو تو) کر سکتے ہو)۔

اس آیت میں بتایا گیا کہ رشتہ داروں کے حقوق عام لوگوں پر مقدم ہیں، سورۂ احزاب ۵ھ میں نازل ہوئی ہے۔ اس سے پہلے، ہجرت مدینہ کے بعد اللہ کے رسول ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان بھائی چارہ کرادیا تھا، اس تعلق کی بنا پر مہاجرین اور انصار ایک دوسرے کے وارث ہوتے تھے۔ آیت بالا کے نزول کے بعد یہ طریقہ موقوف ہوگیا اور وراثت کی بنیاد رشتہ داری کو قرار دیا گیا۔ آیت کے آخری ٹکڑے "**إلا أن تفعلوا إلى أولیائکم معروفا**" کا مطلب یہ ہے کہ (میراث کے مستحق) رشتہ داروں کے علاوہ اپنے دوسرے متعلقین کی مالی مدد کرنا چاہو تو دیگر کسی ذریعہ (مثلاً تحفے یا وصیت وغیرہ) سے ایسا کر سکتے ہو۔

محمد بن الحنفیہؒ فرماتے ہیں: ''اس آیت کے ذریعہ غیر مسلم کے لئے وصیت کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ یعنی اپنے کافر رشتہ دار کے ساتھ ایسا کیا جاسکتا ہے۔ مشرک رشتہ دار سے اگرچہ دین کا تعلق نہیں ہے، لیکن نسبی اعتبار سے وہ رشتہ دار ہے، اس لئے اس کے حق میں وصیت کی جاسکتی ہے''(۱)۔

قتادہؒ، حسنؒ اور عطاؒ فرماتے ہیں: ''اس آیت میں اجازت دی گئی ہے کہ مسلمان اپنے کافر رشتہ دار کو اپنی زندگی میں جو چاہے دے سکتا ہے اور مرتے وقت اس کے لئے وصیت کر سکتا ہے''(۲)۔

پڑوسیوں کے ساتھ خوش گوار تعلقات:

رشتہ داروں کے بعد انسان کا سب سے قریبی تعلق اپنے پڑوسیوں سے ہوتا ہے۔ ان کا ہر وقت ساتھ رہتا ہے۔ پڑوسی اچھے ہوں تو انسان اپنے اہل وعیال، گھر اور مال سے بے فکر ہوکر کاروبار زندگی میں مصروف ہوتا ہے۔ ان کی طرف اطمینان نہ ہو تو اسے کبھی ذہنی یکسوئی نہیں

مل سکتی ۔قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ مسلمان ایک اچھا پڑوسی بنے۔اس کی ذات سے اس کے پڑوسیوں کو کوئی تکلیف نہ پہنچے، وہ ان کے دکھ درد میں کام آئے اور ان کے ساتھ خوشگوار تعلقات رکھے۔قرآن کریم میں ہے:

"وبالوالدین إحسانا وبذی القربی والیتامی والمساکین والجار ذی القربی والجار الجنب والصاحب بالجنب"(سورۂ نساء:۳۶)(ماں باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کرو،قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ اور پڑوسی رشتہ دار سے،اجنبی ہم سایہ سے، پہلو کے ساتھ سے-احسان کا معاملہ رکھو)۔

اس آیت میں تین طرح کے پڑوسیوں کے ساتھ اچھے سلوک کا حکم دیا گیا ہے:ایک **"الجار ذی القربی"**(رشتہ دار پڑوسی)،دوسرا**"الجار الجنب"**(اجنبی پڑوسی)اور تیسرا**"الصاحب بالجنب"**(پہلو کا ساتھی،جس سے تھوڑی دیر کا ساتھ ہوجائے)۔بعض مفسرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ **"الجار ذی القربی"**سے مراد مسلم پڑوسی اور **"الجار الجنب"** سے مراد غیر مسلم پڑوسی ہے(۳)۔

احادیث میں بھی پڑوسیوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کی بہت تاکید آئی ہے۔اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:**"من کان یؤمن باللہ والیوم الآخر فلیحسن الی جارہ"**(۴)(جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو، اپنے پڑوسی کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا چاہئے)۔

دوسری حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے ایک موقع پر صحابہ کرامؓ کی ایک مجلس میں تین مرتبہ ارشاد فرمایا:''اللہ کی قسم، وہ شخص مومن نہیں ہے''۔صحابہ نے دریافت کیا:کون اے اللہ کے رسول ﷺ!فرمایا:**"الذی لا یأمن جارہ بوائقہ"** (۵)(وہ شخص جس کا پڑوسی اس کے شر وفساد سے محفوظ نہ ہو)۔

مذکورہ بالا آیت اور احادیث عام ہیں۔ان میں مسلمان ہونے کی قید نہیں ہے۔

غیر مسلم پڑوسی بھی ان میں شامل ہیں، اسی لئے صحابہ کرامؓ اپنے غیر مسلم پڑوسیوں کے ساتھ بھی حسن سلوک کرتے تھے۔ حضرت مجاہدؒ کہتے ہیں کہ میں حضرت عبداللہ بن عمروؓ کے پاس تھا۔ ان کے ملازم نے ایک بکری ذبح کی تو انہوں نے فرمایا: ''اس کا گوشت تقسیم کرو تو سب سے پہلے ہمارے یہودی پڑوسی کے یہاں بھیجو''۔ ایک شخص نے کہا: کیا آپ اس یہودی کے یہاں بھیجیں گے؟ فرمایا: میں نے نبی ﷺ کو پڑوسی کے بارے میں اتنی تاکید کرتے ہوئے سنا کہ ہمیں اندیشہ ہونے لگا کہ آپ اسے وراثت میں حق دار قرار دے دیں گے(۶)۔

حسن معاشرت:

جب لوگ ایک جگہ رہتے بستے ہیں تو ان کے درمیان سماجی تعلقات قائم ہوجاتے ہیں، باہم خوشگوار تعلقات کے لئے ضروری ہے کہ تمام افراد ایک دوسرے کا خیال رکھیں۔ اپنے پڑوسیوں، ملاقاتیوں اور شرکاء کار کے ساتھ الفت ومحبت سے پیش آئیں۔ ان کی خوشیوں میں شریک ہوں، ان کے غم کو اپنا غم سمجھیں اور ان کی ہمدردی، مواسات، دل جوئی اور غم خواری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں۔ اسلام انسانی جذبات کا پورا لحاظ کرتا ہے۔ وہ غیر مسلموں سے انسانی روابط میں نہ صرف یہ کہ کوئی حرج نہیں سمجھتا، بلکہ ان کی تاکید کرتا ہے:

''لاینهاکم الله عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم أن تبروهم وتقسطوا إلیهم إن الله یحب المقسطین'' (سورۂ ممتحنہ:۸) (اللہ تمہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو، جنہوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ہے، اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے)۔

تکثیری معاشرہ میں رہنے والے دیگر مذاہب کے ماننے والوں سے تعلقات کے سلسلے میں یہ ایک بہت اہم آیت ہے۔ اس میں دو جملے آئے ہیں: ''**أن تبروهم**'' اور ''**تقسطوا إلیهم**''، برّ سے مراد ہے حسن سلوک اور صلہ رحمی کرنا(۷) اس میں زیادہ سے زیادہ حسن سلوک

کرنے کا مفہوم پایا جاتا ہے(البحر: التوسع فی الاحسان الیہ)(۸)،"**تقسطوا إلیهم**" کے معنی بعض مفسرین نے بیان کئے ہیں کہ ان کے ساتھ عدل و انصاف کا معاملہ کرو، جبکہ بعض دیگر مفسرین اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ صلہ رحمی کے طور پر اپنے مال کا کچھ حصہ انہیں دو،"**إن تعطوهم قسطاً من أموالكم على وجه الصلة**"(۹)۔

بعض مفسرین اس آیت کو منسوخ قرار دیتے ہیں، لیکن اکثر مفسرین کی رائے ہے کہ یہ آیت محکم یعنی غیر منسوخ ہے،"**وقال أكثر أهل التأويل: هي محكمة**"(۱۰)۔

امام قرطبیؒ نے لکھا ہے:"**هذه الآية رخصة من الله تعالى فى صلة الذين لم يعادوا المؤمنين ولم يقاتلوهم**"(۱۱)(اس آیت میں اللہ تعالی نے ان غیر مسلموں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی اجازت دی ہے جنہوں نے مسلمانوں کے ساتھ دشمنی نہیں کی اور ان سے جنگ نہیں کی)۔

امام رازیؒ فرماتے ہیں:"**قال أهل التأويل: هذه الآية تدل على جواز البر بين المشركين والمسلمين، وان كانت الموالاة منقطعة**"(۱۲)(مفسرین نے کہا ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکوں اور مسلمانوں کے درمیان نیکی اور حسن سلوک کا معاملہ جائز ہے، اگرچہ ان کے درمیان موالات (یعنی قریبی تعلق رکھنا) ممنوع ہے)۔

غریبوں کا مالی تعاون:

سماج میں کچھ لوگ غریب، محتاج، بے کس اور لاچار ہوتے ہیں، صاحب حیثیت اور مال دار لوگوں کا فرض ہے کہ ان کی خبر گیری کریں، وقت ضرورت ان کے کام آئیں اور ان کا سہارا بنیں۔ قرآن اس معاملے میں مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تفریق روا نہیں رکھتا۔ وہ غیر مسلموں پر بھی انفاق کرنے کا حکم دیتا ہے۔ یہی نہیں، بلکہ ساتھ ہی وہ یہ بھی صراحت سے کہتا ہے کہ غیر مسلموں پر محض اللہ کی خوشنودی کے لئے خرچ کیا جائے، ان سے کسی دنیوی منفعت کی امید نہ رکھی جائے اور انہیں مال کے ذریعہ اسلام قبول کرنے کا لالچ نہ دیا جائے۔ اللہ تعالی فرماتا ہے:

"لیس علیک هداهم ولکن الله یهدی من یشاء وما تنفقوا من خیر فلأنفسکم وما تنفقون الا ابتغآء وجه الله وما تنفقوا من خیر یوفّ إلیکم وأنتم لا تظلمون" (سورۂ بقرہ:۲۷۲)(اے نبی!لوگوں کو ہدایت بخش دینے کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے۔ ہدایت تو اللہ ہی جسے چاہتا ہے بخشتا ہے۔اور راہ خیر میں جو مال تم لوگ خرچ کرتے ہو، وہ تمہارے اپنے لئے بھلا ہے۔آخر تم اسی لئے تو خرچ کرتے ہو کہ اللہ کی رضا حاصل ہو۔تو جو کچھ مال تم راہ خیر میں خرچ کرو گے اس کا پورا پورا اجر تمہیں دیا جائے گا اور تمہاری حق تلفی ہرگز نہ ہوگی)۔

یہ آیت انفاق کے سیاق میں وارد ہوئی ہے۔اس سے پہلے کی آیات میں اہل ایمان سے خطاب کر کے کہا گیا ہے کہ اللہ تعالی نے جو کچھ تمہیں عطا کیا ہے، اسے کھلے چھپے ہر طرح سے، اس کے ضرورت مند بندوں پر خرچ کرو اور شیطان کے پیدا کردہ فقر و فاقہ کے اندیشوں میں مت مبتلا ہو اور اللہ کی راہ میں اپنا اچھا مال خرچ کرو، اس کے لئے خراب مال چھانٹ کر مت رکھو، اسی سیاق میں کہا جا رہا ہے کہ جو کچھ خرچ کرو، اس میں اللہ کی خوشنودی اپنے پیش نظر رکھو، اس کا فائدہ تمہاری ذات کو پہنچے گا اور تمہیں بھرپور بدلہ دیا جائے گا۔ جو لوگ تمہاری مدد کے مستحق ہیں، ان کا ہدایت یافتہ ہونا ضروری نہیں ہے، یہ مت سوچو کہ ان لوگوں پر اس وقت خرچ کریں گے جب وہ اسلام لے آئیں گے۔انہیں ہدایت پر لانا تمہاری ذمہ داری نہیں ہے۔اللہ جس کو چاہے گا ہدایت سے نوازے گا۔تمہارا کام یہ ہے کہ وہ خواہ اسلام قبول کریں یا نہ کریں، اگر وہ ضرورتمند ہیں اور اللہ نے تمہیں نواز رکھا ہے تو ان کی ضرورت پوری کرو۔روایات میں آتا ہے کہ ابتداء میں صحابہ کرامؓ اپنے ان رشتہ داروں پر، جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا، خرچ نہیں کرتے تھے، بعض صحابہ نے اس سلسلے میں حضور ﷺ سے دریافت کیا کہ جو لوگ ہمارے ہم مذہب نہیں ہیں، کیا ان کا کچھ مالی تعاون کیا جا سکتا ہے؟ تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی (۱۳)۔

اعزاز واکرام:

خوشگوار معاشرت کے لئے ضروری ہے کہ سماج کے تمام افراد کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جائے، ان کے ساتھ اعزاز واکرام سے پیش آیا جائے اور انہیں اچھے انداز سے مخاطب کیا جائے، اس معاملے میں بھی قرآن نے مسلم اور غیر مسلم کے درمیان فرق نہیں کیا ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"**واذا حُیّیتم بتحیة فحیو بأحسن منها او ردّوها**" (سورۂ نساء:۸۶) (اور جب کوئی احترام کے ساتھ تمہیں سلام کرے تو اس کو اس سے بہتر طریقہ کے ساتھ جواب دو یا کم از کم اسی طرح)۔

حضرت ابن عباسؓ نے ایک موقع پر فرمایا: "سلام کا جواب دو، خواہ سلام کرنے والا یہودی یا عیسائی یا مجوسی ہو"، اس کے بعد انہوں نے اسی آیت کی تلاوت فرمائی (۱۴)۔

احادیث مبارکہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلموں کو سلام کیا جاسکتا ہے، ان کے سلام کا جواب دیا جاسکتا ہے، اور ان سے مصافحہ کیا جاسکتا ہے۔ حضرت اسامہ بن زیدؓ بیان کرتے ہیں کہ حضور ﷺ کا ایک ایسی مجلس سے گزر ہوا، جہاں مسلمانوں کے علاوہ یہود اور مشرکین بھی تھے، آپ ﷺ وہاں پہنچے تو آپ ﷺ نے سلام کیا (۱۵)۔

صحابہ کرامؓ کا بھی معمول تھا کہ جس سے بھی ان کی ملاقات ہوتی، اسے سلام کرتے تھے اور اس معاملے میں کسی سے کوئی تفریق روا نہ رکھتے تھے۔ وہ دوسروں کو بھی ایسا کرنے کی تاکید کرتے تھے۔ حضرت ابوامامہؓ کی راستہ چلتے ہوئے کسی سے ملاقات ہوتی تو اسے سلام کرتے، خواہ ملنے والا مسلمان ہو یا کوئی اور، چھوٹا ہو یا بڑا۔ ان سے اس سلسلے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ ہمیں سلام عام کرنے کا حکم دیا گیا ہے (۱۶)، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے بارے میں بھی روایات میں آتا ہے کہ وہ سلام کرنے میں پہل کرتے تھے، خواہ ملنے والا مسلمان ہو یا غیر مسلم (۱۷)۔

معاملات:

معاشرہ کے افراد کو قدم قدم پر ایک دوسرے کے تعاون، مدد اور سہارے کی ضرورت ہوتی ہے اور انہیں باہم مختلف معاملات کرنے پڑتے ہیں، ایسا نہ ہو تو ان کے لئے زندگی گزارنا دشوار ہو جائے، جس سماج میں مختلف مذاہب کے ماننے والے رہتے ہوں، وہ ایک دوسرے کے کام آسکتے ہیں اور ایک دوسرے سے معاملات کر سکتے ہیں۔ قرآن اس معاملے میں مذاہب کے اختلاف کو رکاوٹ نہیں بناتا۔ اس کی تعلیم یہ ہے کہ اس کے ماننے والے غیر مسلموں کے اشتراک سے کاروبار کر سکتے ہیں، ان سے رہن، مزارعت وغیرہ کے معاملات کر سکتے ہیں، بغیر کسی کراہت کے ان کی مصنوعات استعمال کر سکتے ہیں، اور انہیں اپنی چیزیں فروخت کر سکتے ہیں، ان کے یہاں اجرت پر کام کر سکتے ہیں اور انہیں اپنے یہاں کام پر لگا سکتے ہیں، غرض ہر طرح کے تجارتی و کاروباری معاملات غیر مسلموں کے ساتھ کئے جا سکتے ہیں۔ مذاہب کے اختلاف سے اس سلسلے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس سلسلے میں قرآن کی اصولی تعلیم یہ ہے:

"**یا أیها الذین آمنوا أوفوا بالعقود**" (سورۂ مائدہ:۱) (اے لوگو جو ایمان لائے ہو! معاہدوں کی پابندی کرو)۔

احادیث وروایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ اور صحابہ کرامؓ غیر مسلموں سے ہر طرح کے معاملات کرتے تھے، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی حیات مبارکہ کے آخری دنوں میں ایک یہودی کے پاس اپنی زرہ رکھ کر اس سے اپنے گھر والوں کی ضروریات کے لئے کچھ غلہ لیا تھا (۱۸)۔ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک مشرک نبی ﷺ کے پاس کچھ بکریاں لے کر آیا، آپ ﷺ نے اس سے ایک بکری خریدی (۱۹)۔ حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح خیبر کے بعد وہاں کی زمین یہود کے پاس رہنے دی، اس شرط کے ساتھ کہ وہ ان میں کاشت کریں گے اور انہیں پیداوار کا نصف ملے گا (۲۰)۔ سفر ہجرت کے موقع پر ایک غیر مسلم کی خدمات حاصل کی گئیں اور

اللہ کے رسول ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ نے اس کی رہنمائی میں مدینہ کا سفر کیا تھا(۲۱)۔ حضرت خبابؓ اپنے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ میں لوہار تھا، میں نے مکہ میں عاص بن وائل (مشہور مشرک) کا کچھ کام کیا تھا(۲۲)۔

امام نوویؒ ایک حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''تمام مسلمانوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اہل ذمہ اور دیگر کفار سے معاملات کئے جاسکتے ہیں بشرطیکہ ان معاملات میں کوئی حرام چیز شامل نہ ہو(۲۳)۔

رواداری:

تکثیریت کا بنیادی عنصر رواداری ہے، یعنی اپنے عقیدہ و مذہب کو حق سمجھتے ہوئے اس سے اختلاف رکھنے والوں کی یہ آزادی تسلیم کرنا کہ وہ جو عقیدہ و مذہب چاہیں اختیار کرسکیں، قرآن اس کا علم بردار ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

''**لا إكراه فى الدين قد تبين الرشد من الغىّ**'' (سورۂ بقرہ:۲۵۶)(دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے، بے شک ہدایت گمراہی سے ممتاز ہوگئی ہے)۔

اللہ تعالی کی رضا تو اس میں ہے کہ تمام انسان سیدھے راستے پر چلیں اور اس کی معصیت سے بچیں، لیکن اس کی مشیت یہ ہے کہ وہ اپنی آزادی سے اپنے لئے عقیدہ و مذہب کا انتخاب کریں؛ چنانچہ اس نے بہ جبر تمام انسانوں کو مسلمان نہیں بنایا ہے اور اپنے پیغمبر کو بھی حکم دیا ہے کہ وہ اس معاملہ میں جبر سے کام نہ لیں۔ قرآن میں صاف الفاظ میں کہا گیا ہے: ''**ولو شاء ربک لآمن من فى الأرض كلهم جميعا أفأنت تُكره الناس حتى يكونوا مؤمنين**'' (سورۂ یونس:۹۹)(اگر تیرے رب کی مشیت یہ ہوتی (کہ زمین میں سب مومن وفرماں بردار ہی ہوں تو سارے اہل زمین ایمان لے آئے ہوتے، پھر کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا کہ وہ مومن ہوجائیں؟)۔

قرآن میں یہ بات بہت زور دے کر کہی گئی ہے کہ اللہ تعالی نے انسانوں کے سامنے

حق واضح کر دیا ہے، ساتھ ہی انہیں ارادہ واختیار کی آزادی بخشی ہے کہ وہ چاہیں تو اسے قبول کر کے دائرہ اسلام میں آ جائیں اور چاہیں تو کفر کی روش پر قائم رہیں:

"**إنا هديناه السبيل إما شاكرا وإما كفورا**" (سورۂ دہر:۳) (ہم نے اسے راستہ دکھا دیا، خواہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا)۔

"**وقل الحق من ربكم فمن شاء فليؤمن ومن شاء فليكفر**" (سورۂ کہف:۲۹) (اور کہہ دو کہ یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے۔ اب جس کا جی چاہے مان لے اور جس کا جی چاہے انکار کر دے)۔

دوسرے مذاہب کی محترم شخصیتوں کا احترام:

قرآن اہل مذاہب سے مکالمہ کا قائل ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ حق واضح کیا جائے اور باطل کی تردید کی جائے اور دیگر مذاہب کے پیروکاروں نے اپنی مذہبی تعلیمات میں جو غلط باتیں شامل کر لی ہیں انہیں چھانٹ کر الگ کر دیا جائے، لیکن وہ تاکید کرتا ہے کہ مذاکرہ ومباحثہ میں سنجیدگی، متانت اور شائستگی ملحوظ رکھی جائے اور ایسا لہجہ نہ اختیار کیا جائے کہ ان کے مذہبی جذبات مجروح ہوں۔ اس سیاق میں اس نے ان شخصیتوں کے بارے میں، جن سے وہ عقیدت رکھتے ہیں، نازیبا کلمات منہ سے نکالنے سے منع کیا ہے۔ اس کی سخت تاکید ہے:

"**ولاتسبّوا الذين يدعون من دون الله فيسبّوا الله عدوا بغير علم**" (سورۂ انعام:۱۰۸) (اور (اے مسلمانو) یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں انہیں گالیاں نہ دو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ شرک سے آگے بڑھ کر جہالت کی بنا پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں)۔

اس آیت کی تفسیر میں علامہ قرطبیؒ لکھتے ہیں: ''اللہ سبحانہ وتعالی نے اس آیت میں بتوں کو برا بھلا کہنے سے منع کیا ہے، اس لئے کہ اگر انہیں برا بھلا کہا جائے گا تو ان کی پوجا کرنے والوں کی نفرت اور کفر میں اضافہ ہوگا۔ علماء کہتے ہیں کہ اس آیت کا حکم اس امت کے لئے ہر زمانے میں باقی ہے'' (۲۴)۔

امام رازیؒ اس آیت کے ذیل میں فرماتے ہیں: ''اللہ تعالی نے اس آیت میں کفار کے معبودوں کو برا بھلا کہنے سے منع کیا ہے؛ اس لئے کہ ممکن ہے کہ اس کے جواب میں وہ اللہ تعالی کے بارے میں نازیبا کلمات کہنے لگیں۔ اس سے اس پہلو کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ اگر تمہارا مخالف جہل اور نادانی کا مظاہرہ کرے تو تمہارے لئے جائز نہیں کہ تم بھی اسی طرح کی باتیں کرنے لگو؛ اس لئے کہ اس طرح باہم جھگڑے اور گالم گلوج کی نوبت آسکتی ہے اور یہ عقل مندوں کا شیوہ نہیں ہے'' (۲۵)۔

غیر مسلموں سے دوستی کی ممانعت کا صحیح مفہوم:

قرآن پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس نے مسلمانوں کو دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھنے سے منع کیا ہے اور نہیں دشمن کہا ہے۔ ظاہر ہے کہ دشمن کے بارے میں بغض ونفرت کے جذبات پروان چڑھتے ہیں۔ ان سے کسی طرح کا تعلق نہیں رکھا جاتا ہے، بلکہ انہیں نقصان پہنچانے کی تدبیریں کی جاتی ہیں۔ اس اعتراض پر بہ طور دلیل اس طرح کی آیات پیش کی جاتی ہیں:

"**یاأیها الذین آمنوا لا تتخذوا الکافرین أولیاء من دون المؤمنین**" (سورۂ نساء: ۱۴۴) (اے لوگو جو ایمان لائے ہو، مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق نہ بناؤ)۔

ایسی آیات پر ان کے صحیح تناظر میں غور کرنے کی ضرورت ہے، اہل ایمان سے کہا گیا ہے کہ وہ کافروں کو اولیاء نہ بنائیں۔ اولیاء ولی کی جمع ہے۔ اس کا مادہ 'ول ی' اور مصدر 'ولاء' ہے۔ ولاء کا مفہوم یہ ہے کہ دو یا دو سے زائد چیزیں اس طرح یکجا ہوں کہ ان کے درمیان کوئی ایسی چیز نہ ہو جو ان سے مغایر ہو۔ اسی سے استعارۃً یہ لفظ قربت کے معنی میں استعمال ہونے لگا؛ خواہ یہ قربت جگہ کی ہو، یا تعلق کی، یا مذہب کی، یا دوستی، مدد اور عقیدہ کی۔ جس شخص سے مذکورہ نوعیّتوں میں سے کسی نوعیت کا تعلق ہو اس کے لئے ولی اور مولی دونوں الفاظ مستعمل ہیں (۲۶)، ایسی آیتوں میں لفظ 'اولیاء' انتہائی قربت کے معنی میں آیا ہے۔ علامہ زمخشریؒ فرماتے ہیں:

"(لاتتخذوهم أولياء) تنصرونهم وتستنصرونهم وتؤاخونهم وتصافونهم وتعاشرونهم معاشرة المؤمنين"(۲۷)(اللہ تعالی کے ارشاد" کافروں کو اولیاء نہ بناؤ" کا مطلب یہ ہے کہ ان سے تمہارا معاملہ ایسا نہ ہو کہ تم ان کی مدد کرو، ان سے مدد چاہو، ان سے بھائی چارہ اور خلوص ومحبت کے تعلقات رکھو اور ان کے ساتھ اس طرح گھل مل کر رہو جس طرح اہل ایمان باہم رہتے ہیں)۔

ان حالات کو بھی نگاہ میں رکھنا ضروری ہے جن میں مسلمانوں کو کافروں سے انتہائی قربت کا تعلق رکھنے سے منع کیا گیا تھا۔ مسلمان سخت حالات سے گزر رہے تھے۔ ان کے خلاف ان کے دشمنوں نے جنگ برپا کر رکھی تھی اور انہیں بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکنے کے درپے تھے۔ یہود و نصاری کا رویہ بھی کھلی دشمنی پر مبنی تھا، وہ مسلمانوں کے خلاف کافروں کا ساتھ دے رہے تھے۔ ایک تیسرا گروہ منافقین کا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو ظاہر میں اسلام کا دم بھرتے تھے اور انہوں نے خود کو مسلمانوں میں شامل کر رکھا تھا، لیکن حقیقت میں وہ کافروں سے ملے ہوئے تھے۔ مسلمانوں کو کوئی کامیابی ملتی تو ان کے سینوں پر سانپ لوٹتے تھے اور انہیں کچھ نقصان پہنچتا تو خوشیاں مناتے تھے۔ یہ سارے لوگ اسلام اور مسلمانوں کی دشمنی پر متحد تھے۔ ایسے حالات میں اپنے دشمنوں سے قریبی تعلق رکھنا مسلمانوں کے لئے انتہائی خطرناک تھا۔ یہ چیز دینی حیثیت سے بھی ضرر رساں تھی اور سیاسی اعتبار سے بھی۔ اسی لئے قرآن نے الگ الگ ہر گروہ کے بارے میں وضاحت سے مسلمانوں کو تاکید کی کہ ان سے 'ولایت' کا تعلق نہ رکھیں (ملاحظہ کیجئے: آیات سورۂ نساء: ۱۴۴، مائدہ: ۵۱، نساء: ۸۹)، اس معاملہ میں قرآن نے اس حد تک تاکید کی کہ جن لوگوں کے باپ اور بھائی دائرہ اسلام میں داخل نہیں ہوئے ہیں اور انہوں نے ایمان پر کفر کو ترجیح دی ہے، ان سے بھی قربت کا ویسا تعلق نہ رکھا جائے، جیسا کہ اہل ایمان کے ساتھ رکھا جاتا ہے؛ اس لئے کہ مبادا ان کے واسطے سے ان کے اسرار کفار تک نہ پہنچ جائیں (سورۂ توبہ: ۲۳)۔

قرآن کریم کی بعض آیات میں ان اسباب کی وضاحت کر دی گئی ہے جن کی بنا پر

مسلمانوں کے علاوہ دوسروں سے انتہائی قربت کا تعلق رکھنے سے منع کیا گیا ہے:

"یاأیها الذین آمنوا لا تتخذوا الذین اتخذوا دینکم هزوا ولعبا من الذین اوتوا الکتاب من قبلکم والکفار أولیاء" (سورۂ مائدہ:۵۷) (اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تمہارے پیش رو اہل کتاب میں سے جن لوگوں نے تمہارے دین کو مذاق اور تفریق کا سامان بنالیا ہے، انہیں اور دوسرے کافروں کو اپنا دوست اور رفیق نہ بناؤ)۔

سورۂ ممتحنہ میں ہے: **"یاأیها الذین آمنوا لا تتخذوا عدوی وعدوکم أولیاء"** (سورۂ ممتحنہ:۱) (اے لوگو جو ایمان لائے ہو، میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ)۔

اسی سورت میں آگے ہے: **"إنما ینهاکم الله عن الذین قاتلوکم فی الدین وأخرجوکم من دیارکم وظاهروا علی إخراجکم أن تولوهم ومن یتولهم فأولئک هم الظالمون"** (سورۂ ممتحنہ:۹) (تمہیں جس بات سے روکتا ہے وہ تو یہ ہے کہ تم ان لوگوں سے دوستی کرو جنہوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا ہے اور تمہارے اخراج میں ایک دوسرے کی مدد کی ہے، ان سے جو لوگ دوستی کریں وہی ظالم ہیں)۔

پہلی آیت میں بتایا گیا کہ ان لوگوں نے تمہارے دین کو مذاق اور کھیل بنا رکھا ہے، اس کو وہ سنجیدگی سے نہیں لے رہے ہیں۔ دوسری آیت میں کہا گیا کہ وہ اللہ اور تمہارے دشمن ہیں، اور تیسری آیت میں یہ وضاحت کی گئی کہ وہ محض دین کی وجہ سے تم سے جنگ کر رہے ہیں، تمہیں تمہارے وطن سے نکالا ہے یا اس میں مدد کی ہے۔ یہ اسباب بجا طور پر اس بات کے متقاضی تھے کہ ان سے قریبی تعلق نہ رکھا جائے۔

یہی مضمون ایک دوسری آیت میں یوں مذکور ہے:

"یاأیها الذین آمنوا لا تتخذوا بطانة من دونکم لا یألونکم خبالا ودّوا ماعنتم قد بدت البغضاء من أفواههم وما تخفی صدورهم أکبر" (سورۂ آل

عمران:۱۱۸)(اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنی جماعت کے لوگوں کے سوا دوسروں کو اپنا راز دار نہ بناؤ، وہ تمہاری خرابی کے کسی موقع سے فائدہ اٹھانے سے نہیں چوکتے، تمہیں جس چیز سے نقصان پہنچے وہی ان کو محبوب ہے، ان کے دل کا بغض ان کے منہ سے نکلا پڑتا ہے اور جو کچھ وہ اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے ہیں وہ اس سے شدید تر ہے)۔

اس آیت میں لفظ 'بطانۃ' کے استعمال میں بڑی بلاغت پائی جاتی ہے۔ بطانۃ کپڑے کے اندرونی حصے کو کہتے ہیں، جو جسم سے متصل ہوتا ہے۔ بہ طور استعارہ اس کا اطلاق اس شخص پر کیا جاتا ہے جسے آدمی اپنا گہرا دوست اور ہم دم وہم راز بنالے(۲۸)، اس آیت میں مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ اپنے علاوہ دوسروں سے اتنا قریبی تعلق استوار نہ کرلو کہ ان پر اپنے راز منکشف کردو؛ اس لئے کہ وہ لوگ تمہارے بہی خواہ نہیں ہیں، تمہیں نقصان پہنچانے کا کوئی موقع وہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور تم سے دشمنی اور نفرت ان کے رویے سے عیاں ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ غیر مسلموں سے صرف ایسے قریبی تعلق سے منع کیا گیا ہے جس سے اسلامی ریاست کے سیاسی وعسکری راز دشمنوں پر منکشف ہوجائیں اور مسلمانوں کے مسائل میں اضافہ ہوجائے اور یہ ممانعت صرف ان لوگوں سے ہے جو مسلمانوں کے ساتھ برسر جنگ ہوں یا ان کے دشمنوں کے مددگار بنے ہوئے ہوں۔ جہاں تک عام انسانی اور سماجی تعلقات رکھنے کی بات ہے وہ اس ممانعت میں داخل نہیں ہے، علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں:

"**الاحسان والهبة مستثناة من الولاية**"(۲۹)(غیر مسلموں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا اور انہیں کچھ دینا 'ولایت' میں شامل نہیں ہے)۔

مخالفوں سے لڑنے اور انہیں قتل کرنے کے احکام کا پس منظر:

قرآن پر ایک بڑا، بلکہ شاید سب سے بڑا اعتراض اس کے تصور جہاد پر ہوتا ہے، کہا جاتا ہے کہ اس میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ غیر مسلموں سے جنگ کریں، ان کے ساتھ سختی سے پیش آئیں، ان کے لئے گھات لگائیں اور انہیں جہاں پائیں قتل کریں۔ بہ طور

دلیل یہ آیات پیش کی جاتی ہیں:

"یاأیها الذین آمنوا قاتلوا الذین یلونکم من الکفار ولیجدوا فیکم غلظة" (سورۂ توبہ:۱۲۳) (اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جنگ کرو ان کافروں سے جو تمہارے پاس ہیں اور چاہئے کہ وہ تمہارے اندر سختی پائیں)۔

"فاقتلوا المشرکین حیث وجدتموهم وخذوهم واحصروهم واقعدوا لهم کل مرصد" (سورۂ توبہ:۵) (تو مشرکوں کو قتل کرو جہاں پاؤ اور انہیں پکڑو اور گھیرو اور ہر گھات میں ان کی خبر لینے کے لئے بیٹھو)۔

اس طرح کی آیات پیش کر کے یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ جب تک یہ آیات ہیں اس وقت تک مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان بقائے باہم ممکن نہیں۔

یہ غلط فہمی درحقیقت جنگ کے بارے میں قرآن کے احکام وتعلیمات کو صحیح تناظر میں نہ دیکھنے اور متعلقہ آیات کو ان کے سیاق وسباق سے ہٹا کر پڑھنے کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے، اس موضوع پر متعدد پہلوؤں سے غور کرنے کی ضرورت ہے:

الف- جب مسلمانوں کو حد سے زیادہ ستایا جانے لگا تب انہیں اجازت دی گئی کہ وہ اپنے اوپر ہونے والے ظلم کا جواب دے سکتے ہیں:

"أذن للذین یقاتلون بأنهم ظلموا وإن الله علی نصرهم لقدیر، الذین أخرجوا من دیارهم بغیر حق إلا أن یقولوا ربنا الله" (سورۂ حج:۳۹-۴۰) (اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جارہی ہے، کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیئے گئے، صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے تھے: ہمارا رب اللہ ہے)۔

اسلامی تاریخ شاہد ہے کہ جنگ کا آغاز مسلمانوں نے نہیں کیا تھا، بلکہ ان پر جنگ تھوپی تھی، دشمنوں کا منصوبہ تھا کہ مسلمانوں کو، جو ابھی کمزور ہیں، ابتدائی مرحلے ہی میں کچل دیں

اور شمع اسلام کو اپنی پھونکوں سے گل کر دیں، اس صورت حال میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ ان کا منہ توڑ جواب دیں اور ان کے منصوبوں کو خاک میں ملا دیں، لیکن اس وقت بھی انہیں تاکید کی گئی کہ ان کے ساتھ جتنی زیادتی کی گئی ہے اتنا ہی بدلہ لیں، حد سے تجاوز نہ کریں:

"وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا إن اللہ لا یحب المعتدین" (سورۂ بقرہ:۱۹۰) (اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں، مگر زیادتی نہ کرو کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا)۔

ب- قرآن کریم میں مذکور آیات قتال کا تعلق عام حالات سے نہیں ہے، بلکہ ان میں دوران جنگ کے سلسلے کی ہدایات دی گئی ہیں، جب کسی گروہ سے جنگ برپا ہو تو میدان جنگ میں ایک فریق دوسرے فریق کے ساتھ کوئی رورعایت نہیں برتتا، بلکہ ہر ایک کی کوشش ہوتی ہے کہ اپنے مخالف کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچائے اور اس کے افراد کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں قتل کر کے اس کی فوجی طاقت پارہ پارہ کر دے، اس موقع پر کسی کم زوری اور نرمی کا مظاہرہ خود اپنے کو ہلاکت میں ڈالنے کے مثل ہے۔

ج- جنگ ایک ناپسندیدہ، لیکن ناگزیر صورت حال ہے، اسی لئے مختلف مذاہب میں اس کے بارے میں احکام پائے جاتے ہیں، جن مذاہب میں جنگ سے متعلق کسی طرح کی تعلیم نہیں ملتی ان کے پیرووں کو بھی مختلف مواقع پر جنگ کرنے پر مجبور ہونا پڑا ہے، مذہبی کتابوں میں جنگ سے متعلق احکام وقوانین ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کا تعلق دشمن قوم کے ساتھ عام برتاؤ سے ہے، بلکہ ظاہر ہے کہ ان میں جنگ کی مخصوص صورتحال کا بیان ہے۔ مثال کے طور پر ذیل میں ہندومت کی مذہبی کتابوں کے چند حوالے دیئے جاتے ہیں:

''اے اِندر، ہم کو بہادرانہ سطوت عطا کر، آزمودہ کاری اور اس روز افزوں قوت کے ساتھ، جو مال غنیمت حاصل کرتی ہے۔ تیری مدد سے ہم جنگ میں اپنے دشمنوں کو مغلوب کریں، چاہے وہ اپنے ہوں یا پرائے، ہم ہر دشمن پر فتح مند ہوں۔ اے بہادر، ہم تیری مدد سے دونوں قسم

کے دشمنوں کو قتل کر کے خوش حال ہوں، بڑی دولت کے ساتھ'' (۳۰)۔

''اے اگنی، ہماری مزاحمت کرنے والی جماعتوں کو مغلوب کر، ہمارے دشمنوں کو بھگا دے۔ اے اجیت، دیوتاؤں کو نہ ماننے والے حریفوں کو قتل کر اور اپنے پجاری کو عظمت وشوکت نصیب کر'' (۳۱)۔

''اے مینو، طاقتور سے زیادہ طاقتور ہو کر ادھر آ اور اپنے غضب سے ہمارے تمام دشمنوں کو ہلاک کر دے، دشمنوں اور ورتیروں اور دسیوں کو قتل کرنے والے تو ہمارے پاس ہر قسم کی دولت اور خزانے لا'' (۳۲)۔

بھاگوت گیتا کا تو موضوع ہی جنگ ہے، یہ دراصل کرشن جی کے اس طویل اپدیش پر مشتمل ہے جو انہوں نے پانڈوؤں کے سردار ارجن کو، جنگ پر ابھارنے اور لڑنے کی ترغیب دینے کے لئے دیا تھا۔

د-ایک چیز یہ بھی ملحوظ رکھنے کی ہے کہ ان آیات کا خطاب اسلامی ریاست اور اس کی فوج سے ہے۔ قرآن نے تمام مسلمانوں کو کھلی چھوٹ نہیں دے دی ہے کہ وہ جب چاہیں اور جہاں چاہیں غیر مسلموں کو قتل کر دیں، بلکہ اسلامی ریاست سے دشمنی رکھنے والے غیر مسلموں سے جنگ کا فیصلہ کرنے کا اختیار صرف سربراہ ریاست کو ہے۔ اسی کو طے کرنا ہے کہ جنگ کی جائے یا نہیں؟ اور کی جائے تو کب اور کیسے؟ رعایا پر ہر حال میں اس کی اطاعت لازم ہے۔ علامہ ابن قدامہؒ نے لکھا ہے:

''**أمر الجهاد موكول الى الامام واجتهاده ويلزم الرعية طاعته فيما يراه من ذلك**'' (۳۳) (جہاد کا معاملہ سربراہ ریاست کے ذمہ ہے۔ وہی اس کا فیصلہ کرے گا اور رعایا پر اس کے فیصلے کو تسلیم کرنا لازم ہے)۔

جن آیات میں 'کفار ومشرکین' سے جنگ کا حکم دیا گیا ہے، اگر ان کا مطالعہ ان کے سیاق میں کیا جائے اور ان حالات کو بھی پیش نظر رکھا جائے جن میں وہ نازل ہوئی تھیں تو کوئی

اعتراض وارد نہیں ہوگا، بلکہ پڑھنے والے پر ان کی معقولیت آشکار ہوگی۔

حواشی ومراجع:

۱-قرطبی، الجامع لاحکام القرآن، الہیئۃ المصریۃ العامۃ ۱۴/ ۱۲۶، ۱۹۸۷ء۔

۲-ایضا۔

۳-ایضا ۵/ ۱۸۳، علامہ قرطبی نے ان کا نام نوف الشامی بتایا ہے۔

۴-صحیح بخاری، کتاب الادب، باب من کان یومن باللہ والیوم الآخر لا یوذ جارہ، صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الحث علی اکرام الجار۔

۵-صحیح بخاری، کتاب الادب، باب اثم من لایأ من جارہ بوائقہ، صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب تحریم ایذاء الجار۔

۶-بخاری، الادب المفرد ۱/ ۲۲، سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی حق الجوار۔

۷-ابن کثیر، ابوالفداء عماد الدین اسماعیل، تفسیر القرآن العظیم (تفسیر ابن کثیر) المکتبۃ التجاریۃ الکبری مصر، ۴/ ۳۴۹، ۱۳۵۶ھ، لسان العرب ۴/ ۵۴، مادہ: بر۔

۸-راغب الاصفہانی، المفردات فی غریب القرآن، المطبعۃ الیمنیۃ مصر ص ۹۳، ۱۳۲۴ھ۔

۹-ابن العربی، ابوبکر محمد بن عبد اللہ المالکی الاشبیلی، احکام القرآن، مطبعۃ السعادۃ مصر ۲/ ۲۴۹، ۱۳۳۱ھ، الماوردی، ابوالحسن علی بن حبیب البصری، النکت والعیون (تفسیر الماوردی)، مطابع القہوی الکویت، ۴/ ۲۲۳، ۱۴۰۲ھ، تفسیر قرطبی ۱۸/ ۵۹، رازی، فخر الدین محمد بن عمر، مفاتیح الغیب (التفسیر الکبیر) المطبعۃ العامرۃ مصر ۸/ ۱۳۴، ۱۳۰۸ھ۔

۱۰-تفسیر قرطبی ۱۸/ ۵۹۔

۱۱-حوالہ سابق۔

۱۲-تفسیر کبیر ۸/ ۱۳۴۔

۱۳-ابوجعفر محمد بن جریر الطبری، جامع البیان عن تأویل آی القران (تفسیر الطبری)، دار المعارف مصر ۵/ ۵۸۸، ۱۹۶۹ء، تفسیر کبیر ۲/ ۳۶۵۔

۱۴-بخاری، الادب المفرد، باب کیف الرد علی أہل الذمہ ۲/ ۵۳۳۔

۱۵-صحیح بخاری، کتاب الاستئذان، باب التسلیم فی مجلس فیہ أخلاط من المسلمین والمشرکین، صحیح مسلم، کتاب الجہاد، باب ما لقی النبی ﷺ.....الخ۔

۱۶-احمد بن علی بن حجر العسقلانی، فتح الباری بشرح صحیح البخاری، دار المعرفۃ بیروت ۱۱/ ۴۱۔

۱۷-عبد الرزاق، المصنف، کتاب أہل الکتاب، باب السلام علی أہل الکتاب۔

۱۸-صحیح بخاری، کتاب البیوع، باب شراء النبی ﷺ بالنسیئۃ ودیگر ابواب، صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ، باب

الرہن وجوازہ فی الحضر کالسفر۔
۱۹-صحیح بخاری، کتاب البیوع، باب الشراء والبیع مع المشرکین وأہل الحرب، صحیح مسلم، کتاب الاشربۃ، باب اکرام الضیف۔
۲۰-صحیح بخاری، کتاب المزارعۃ، باب المزارعۃ مع الیہود ودیگر ابواب، صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ، باب المساقاۃ والمعاملۃ بجزء من الثمر والزرع۔
۲۱-صحیح بخاری، کتاب الاجارۃ، باب استئجار المشرکین عند الضرورۃ۔
۲۲-صحیح بخاری، کتاب الاجارۃ، باب ہل یواجر الرجل نفسہ من مشرک فی دار الحرب۔
۲۳-نووی، شرح صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ، باب الرہن۔
۲۴-تفسیر قرطبی۔
۲۵-تفسیر کبیر۔
۲۶-المفردات فی غریب القرآن/ ۵۵۵۔
۲۷-ابو القاسم جار اللہ محمود بن عمر الزمخشری، الکشاف عن حقائق التنزیل، مصطفیٰ البابی الحلبی واولادہ مصر ۱/ ۱۶۹، ۱۹۷۳ء۔
۲۸-تفسیر طبری، ۷/ ۱۳۸، کشاف ۱/ ۴۵۸، تفسیر قرطبی ۴/ ۱۷۸۔
۲۹-تفسیر قرطبی ۸/ ۹۴۔
۳۰-رگ وید ۶:۱:۸-۱۳۔
۳۱-یجر وید ۷:۳:۹۔
۳۲-اتھر وید ۱:۲:۳۲:۴-۳۔
۳۳-ابن قدامہ، ابو محمد عبد اللہ بن احمد بن محمد المقدسی، المغنی علی مختصر الخرقی، مکتبۃ الریاض الحدیثۃ ریاض ۸/ ۳۵۲، ۱۹۸۱ء۔

☆☆☆